مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مرزا غالب پر خصوصی گوشہ

اپریل ۲۰۱۵ء تا جون ۲۰۱۵ء

مُدیر:
نوید ظفر کیانی

مشاورت:
کے ایم خالد
روبینہ شاہین
محمد امین

ارمغان ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت
mudeer_ai@yahoo.com

مروی ہے کہ ایک عورت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی اور عرض کی ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے سواری کے لئے اونٹ عطا فرمائیں۔'' ارشاد فرمایا ''ہم تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کریں گے۔'' اُس نے عرض کی ''میں اس کا کیا کروں گی وہ تو مجھے نہیں اٹھا سکے گا''، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہر اونٹ، اونٹ ہی کا تو بچہ ہوتا ہے۔''

(سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب ما جاء فی المزاح، جلد ۴، صفحہ ۳۸۹، حدیث ۴۹۹۸ بتغیر)

کیا کیا کہاں کہاں

چوکے

لکھنے والے — **ادارہ**

پیروڈیاں

حلقہ اربابِ مزاح

اپنے ڈھانچے کی مضبوطی کو پرکھنے کے آخری مراحل میں ہے

اغراض و مقاصد

☆ زمانے، اپنی ہی منتخب کردہ حکومتوں، اپوزیشن اور دھرنوں سے ایوں ہی ستائی ہوئی مخلوق کے چہروں پر مسکراہٹیں سجانے کی کوشش کرنا۔

☆ نئے مزاح نگار اور مزاح گو شعراء کے کام کو زمانے کے سامنے لانا۔

☆ تنظیم کے پلیٹ فارم سے مزاحیہ ادب اور مزاحیہ شاعری کی کتابوں کی رونمائی کروانا۔

☆ نئے لکھنے والے مزاح نگاروں کی راہنمائی کے لئے مزاح کی ورکشاپس کا انعقاد کروانا

مزاح نگاروں اور مزاح گو شعراء کی ایک ملک گیر تنظیم

شرگوشیاں

ایک تو ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہمارے رونگٹے پہلے ہی خرگوش کے کانوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ ہر لمحہ شام کے اخبار کی طرح ''ہوشیار، خبردار'' کے آوازے لگاتا ہوا گزرتا ہے۔ ہر طرف سے بریکنگ نیوز کی ٹیونیں گونجتی سنائی دیتی ہیں۔

زیادہ دن نہیں گزرے، پی ٹی وی پر ایک ادبی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ غالباً مولانا الطاف حسین حالیؔ کی بابت اظہارِ خیال کیا جا رہا تھا۔ دورانِ گفتگو شرکائے محفل میں سے ایک صاحب کی بات سُن کر میں چونک پڑا۔ اُنھوں نے انکشاف فرمایا تھا کہ اعلیٰ سطح پر اس امر پر غور کیا جا رہا ہے کہ اُردو کے رسم الخط کو تبدیل کر دیا جائے۔ کچھ بزرجمہروں کو بین الاقوامیت کے چشمے سے دیکھنے پر اُردو کے رسم الخط میں رجعت پسندی کی کبھی بڑی نظر آ رہی ہے چنانچہ غور فرمایا جا رہا ہے کہ اُردو رسم الخط کو رومن رسم الخط میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ اُسے دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ اِس اطلاع کی تصدیق ایک دوسرے باوثوق ذریعے نے بھی کر دی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہر دور کے ہر حکمران کو ہاتھ گھما کر کان پکڑنے کا از حد شوق رہا ہے۔ جانے اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر اُن کی عقل شریف ہانپنے کیوں لگ جاتی ہے۔ ہمارے موجودہ حکمرانوں کو ہی لے لیجیے، عوام الناس نے اُنھیں جس مینڈیٹ سے نوازا، اُنھیں سرکار نے ''زورِ خطابت'' کے کھاتے میں ڈال دیا اور آپ میٹرو بس کی دھونی رما کر بیٹھ رہے۔ اہلِ وطن کی آنکھوں میں سچ مچ کی دھول جھونکی جا رہی ہے (راولپنڈی اور اسلام آباد کے شہری اس رمز سے بخوبی واقف ہیں)۔ اِس ضمن میں ایسے ہفیائے ہوئے شعور سے کسی خیر کی توقع عبث ہے۔ یہی لچھن رہے تو ان کا حال بھی اُنہیں صاحب جیسا ہونا ہے جس نے ایک مرتبہ دورانِ سفر ایک دوسرے صاحب سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔۔۔''میں شاعر ہوں!''

دوسرے صاحب نے جواباً اپنا تعارف یوں کروایا تھا۔۔۔''میں بہرہ ہوں!!''

اُردو کا موجودہ رسم الخط کسی عمرو عیار کی زنبیل سے براہِ راست برآمد نہیں کیا گیا ہے بلکہ صدیوں کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کے مقدر کو کسی بیوروکریسی قسم کی مخلوق کے ہتھے چڑھا دیا گیا، یا جعلی ڈگری یافتہ کسی سیاستدان کے جتھے (کمیٹی) کے سپرد کیا گیا تو اس کا انجام بھی وہی ہو گا جو موجودہ سیاسی نظام کا ہو چکا ہے، جس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی ہے۔

اگر رومن رسم الخط کو اُردو کے موجودہ رسم الخط کی جگہ نافذ کر دیا گیا تو میں ابھی سے اعلان کرتا ہوں کہ پہلا 'ناخواندہ' یہ حقیر پُرتقصیر ہو گا۔

اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

فقط احقر

نوید ظفر کیانی

صالحہ عابد حسین

غالب کے کلام میں بیگم غالب کا حصہ

غالب کا چند جُز کا دیوان ہمیشہ سے ہماری محبوب کتاب رہی ہے، اُس کا ننھا سا جرمن ایڈیشن تو تعویز کی طرح سفر اور حضر میں ساتھی بنا رہتا ہے۔ دل خوش موڈ ٹھیک اور طبیعت موزوں ہو تو غالب کے دلکش اور پُر جوش اور طرب افزا اشعار اور پھڑکتی ہوئی غزلیں دماغ اور زبان پر رہتی ہیں، پریشانی ہو تو پُر سوز و پُر اثر شعر دل بہلاتے ہیں۔ رنج و غم ہو تو مایوسی و ناکامی سے بھرپور شعرا سے ہلکا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بیماری کی شدت میں ہمارا ذہن غالبؔ کے حسین و پُر اثر اشعار کی نامعقول پیروڈی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جی ہاں یہ گستاخی عام طور پر بیماری کی شدید تکلیف ہی میں ہوتی ہے۔ مثلاً ہمارے گردوں کا آپریشن ہوا تو یہ شعر الہام ہو ۔

شق ہو گیا ہے گردہ خوشا لذتِ فراق
تکلیف پردہ داریٔ دردِ کمر گئی

اور دمہ کے شدید دوروں میں تو غالبؔ کے اشعار ذرا سیر دو بدل سے ہمارے بڑے آسانی سے بن جاتے ہیں ۔

یہ مرض دمے کا بھی جانے کیا قیامت ہے
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

یا

کھانسی ہے صبر طلب سانس ہمارا بیتاب
دل کا کیا رنگ کریں خونِ جگر ہونے تک

اور

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ سر ہوئے وہ یہاں آ کے دم ہوئے

اِس ذکر سے مطلب نصیبِ دشمناں یہ غلط فہمی نہیں کہ خدانخواستہ ہم میں شعر گوئی کے جراثیم موجود ہیں بلکہ اس محبت اور شفقت کا اعتراف ہے جو ہم کو غالبؔ کے اشعار سے ہے کہ درد کی تکلیف میں کمی بھی اِسی بہانے ہوتی ہے۔

ایک رات کچھ ایسی حالت تھی ۔ دمے کی تکلیف سء کئی راتیں آنکھوں میں کٹ چکی تھیں، تیماردار تھک کر سو گئے تھے۔ مگر ہماری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور دماغ تھا کہ غالبؔ کے اس شعر کا ورد کئے جا رہا تھا، ذرا سے تصرف کے بعد ۔

کاوے کاوے سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ایک شعر کی تکرار سے تنگ آ کر ہم نے سرہانے کی الماری سے ہاتھ بڑھا کر دیوانِ غالبؔ اُٹھایا، لیمپ کا بیڈ سوئچ دبایا اور دمہ کی رات اور ہجر کی شب کا موازنہ شروع کر دیا کہ کون سی زیادہ سخت اور زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے ۔

کیوں اندھیری ہے شبِ دم ہے بلاؤں کا ہجوم
آج ادھر کو ہی رہے گا دیدۂ اختر کھلا

پڑھتے پڑھتے جب اِس شعر پر پہنچی ۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اِک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

تو ہم ٹھٹھک گئے، کیا یہ شعر غالب کا ہے یا اس کی بیوی کا؟ بھلا مرنے کے مدت بعد یہ شعر کہہ کر کیسے بھیج سکتے تھے، ابھی تک تو وائرلیس کا ادھر سے اُدھر براہِ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا ہے اور پھر مدت بعد اس ملک سے غالبؔ کو اور کون یاد کرتا، سوائے اس کی بیوی کے۔

میں سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنے سرہانے سے کسی کی ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔۔۔ یہ کون ہنسا؟ میں نے تکئے پر ٹکے سر کو بمشکل اٹھایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ سر سے پاؤں تک سفید پاکیزہ لباس میں ملبوس ایک نورانی صورت بی بی ہاتھ میں تسبیح لئے بیٹھی ایک خاص انداز میں ہنس رہی ہیں۔ جیسے ماں بچے کی نادانی پر پیار بھری طنزیہ ہنسی ہنستی ہے۔ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دلی کی پاکیزہ اور لوچ دار اور شیریں زبان میں خاص عورتوں کے لہجے میں بولیں ''بچی، تُو تو غالبؔ کی بڑی دلدادہ ہے ناں! اور خیر سے اللہ رکھے اپنے نزدیک شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتی ہے، کیوں جھوٹ کہتی ہوں؟ پھر بھی تجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ غالب کا ''اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے'' ہے یا اُن کی بیوی کا؟''

مجھے حیرت تھی کہ یہ کون بی بی ہیں جو ایسی پیاری زبان بول رہی ہیں اور بغیر کہے میرے خیالات جان گئیں۔

''ہاں ہاں! تیرا خیال درست ہے، یہ شعر غالبؔ کی بیوی ہی کا ہے اور ایک اِسی شعر پر کیا موقوف ہے، غور سے اُن کا دیوان پڑھو، بیوی پھر دیکھو گی کہ اُن میں کتنے شعر اُن کی بیوی کے موجود ہیں۔''

اب تو میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ واہ یہ بزرگ خاتون بھی خوب ہیں، کس آسانی اور یقین سے وہ اتنا بڑا دعویٰ کر رہی ہیں، آخر ان کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے۔

میں نے جرأت کر کے پہلی بار زبان کھولی مگر ''مثلاً'' سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

اے بوا۔۔۔ مثالیں کہاں تک دوں گی، دو چار دس بیس شعر ہوں تو کوئی مثالوں سے سمجھائے۔ وہاں تو کتنی غزلوں میں اُس کے شعر موجود ہیں، ذرا دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ اور عقلِ سلیم ہو تو ہی اس کی پرکھ ہو سکتی ہے بچی، تو نے اس شعر کے

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

جائے، بگر میں ایسی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہ تھی۔

''بھلا یہ آپ کیا فرمارہی ہیں۔۔۔ غالب کی دقیانوسی، ان پڑھ بیوی بھلا شعر اور ایسے شعر کہتیں جن پر آج تک اہلِ ذوق کو غالب کا دھوکہ ہوتا رہا ہے، یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی۔''

ایک لمحے کے لئے بڑی بی کا چہرہ تمتما اٹھا مگر پھر شفقت بھری مسکراہٹ چہرے پر پھیلنے لگی۔

''احمق! یہ تیرا نہیں تیرے زمانے کا قصور ہے۔ آج کی لڑکیاں اسکولوں میں چار غرف گٹ پٹ کے پڑھ کر اپنے کو عالم فاضل سمجھتی ہیں اور پرانے زمانے کی عورتوں کو جاہل محض۔۔۔ تونے کیسے یہ سمجھا کہ غالب کی بیوی جاہل، بیوقوف اور دقیانوسی تھی۔ وہ ایک عالم فاضل خاندان کی بیٹی تھی جو ذوقِ شعر و سخن میں سارے ہندوستان میں مشہور تھا۔ پھر اس کا غالب جیسے شاعر کا پچاس سال سے زیادہ ساتھ رہا تھا یا نہیں؟ تو بوا ایسے گھرانے کی لڑکی، ایسے کاوند کی بیوی اور اگر اللہ میاں نے بھی اُسے شعر کہنے کا ذوق دیا ہو تو پھر؟؟ پھر بھی تو کہے گی کہ اُس کا شعر کہنا اور اچھے شعر کہنا کیسے ممکن ہے؟؟؟''

میری دلچسپی اب محویت کی حد تک پہنچ گئی تھی اور زبان کھولنے کی یوں بھی جرأت مشکل تھی۔

غالب کے دیوان میں تجھے کتنے ہی شعر ملیں گے جو اُن کے نہیں اُن کی بیوی کے ہیں۔ جانتی ہو بوا کہ ان دونوں کا بیاہ بہت نو عمری میں ہو گیا تھا۔ کچھ شعر نوجوانی کی اسی رنگین زمانے کی یادگار ہیں۔ جب غالب کا بانکا اور مردانہ حسن اُس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا، مشرقی حیادار بیوی ہوتے ہوئے بھی آخر دل تو وہ بھی رکھتی تھی، نامراد، اسی زمانے کا ایک شعر ہے۔

خطِ سبزہ سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

ایک بار سج بن کر کہیں جانے لگے، بیوی کو دھج دکھانے آئے کہ کیسا لگ رہا ہوں فی البدیہہ کہا ۔

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

بارے میں کیا سوچا اور یہ شعر بتا کس کا ہے ۔

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

اب تو میں اور چونکی ہوئی، یعنی ان بی بی حضرت نے غالب کا اتنا اچھا شعر بھی ان کی بیوی کو بخش دیا۔ اس طرح تو یہ سارا دیوان کا دیوان ان کے نام منسوب کر دیں گی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے احتجاج کیا ''مگر دیکھئے تو مصرع ہے ؏

''وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے''

وہ پھر ہنسیں، وہی بزرگانہ ہنسی، اے ہے محبت کرنا آج کل کی لڑکیوں کو خوب آتا ہے۔ اول تو مصرع یوں ہوتب بھی غالب کی بیوی کا ہو سکتا ہے، مگر وہ یوں نہیں یوں ہے جیسے میں نے سنایا۔ تو تو جانتی ہوگی کہ پہلے زمانے میں یائے معروف اور یائے مجہول ایک ہی طرح چھوٹی ''ی'' کے انداز میں لکھی جاتی تھی، غالب کی بیوی بیچاری کے کتنے ہی شعر تو کتابت کے اسی اصول کے سر صدقے ہوگئے۔''

بھلا میں کیسے مان لیتی کہ میرے محبوب ترین شاعر غالب کے اشعار کسی اور کی ملکیت ہیں۔ ڈر تو لگتا تھا کہ ڈانٹ نہ پڑ

''یہ تو بیوی تم جانتی ہو کہ شاعر عاشق ضرور ہوتا ہے چاہے سچا عاشق ہو یا جھوٹ موٹ بن جاتا ہو۔اب بوا جانے میری بلا کہ وہ جو عشقیہ شعر کہتے تھے تو سچ مچ کسی پر عاشق تھے یا بیوی کو جلانے کے لئے بن گئے تھے۔''

بیوی نے کبھی ڈومنی دومنی کو آنکھ سے کبھی نہیں دیکھا، مگر ان کے شعروں میں ان کے عشق کی داستان کو پڑھا اور سنا ضرور کرتی تھی۔۔۔اور تم بھی بوا عورت ہو، عورت کے دل کا حال سمجھ سکتی ہو۔شریف زادیاں منہ سے نہ کہیں، چاہتی یونہی ہیں کہ اُن کا میاں اُن کی محبت کی داستان کے سوا کسی اور کا ذکر ہی نہ کرے۔مگر ہے؟

ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ بے زبان محبت مرد شاعر یا اُس کی بازاری معشوقہ نگوڑی کیا کھا کر کرے گی، بیوی جب میاں سے شکایت کرتی تو وہ یا تو کوئی بہانہ بنا دیتے یا کہتے ہم تو یہ باتیں محض تمہارے آزمانے کو کہتے ہیں تو اس کے سوا وہ اور کیا کہتی ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

غالبؔ ٹھہرے شاعر اور وہ بھی غزل گو، رند مشرب، اب تم ہی کہو اُن کی باتیں سن سن کر بیوی کا دل جلتا یا نہ جلتا؟ اُن کی بیوی کے اُس زمانے کے شعروں میں شکوہ و شکایت بھی ہے اور اپنی چپکی چپکی شریف زادیوں والی محبت کا اظہار بھی، طعنے تشنے بھی ہیں اور نصیحت فضیحت بھی، مگر بوا! غور کرو گی تو ہر جگہ اقیسی اپنائیت پاؤ گی جو صرف بیوی کا ہی حصہ ہو سکتی ہے۔تم ہی کہو یہ شعر کس کا ہو سکتا

لیکن یہ سب منہ سے کہنے کی باتیں تھیں، بیوی کے دل کی سچی آواز تو وہی تھی ؎

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

لیکن رشک اور رقابت تو پیچھا بھی نہیں چھوڑتے، جب کبھی بھولے بسرے غالبؔ اس کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ شعروں ہی

میں دل کی لگی کا اظہار کیا کرتی۔ جانتی تھی ناں کہ حساس شاعر کے دل پر کیا چیز زیادہ اثر کرتی ہے۔ اس قسم کے دو چار شعر بھی سن لے۔ ایک دن آبدیدہ بیٹھی تھی، غالب نے پوچھا ''کیا بات ہے؟'' تنک کر بولی:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

اِس لفظ کوئی سے مجھے نشان نہیں ملتا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ اور اگر وہ کبھی دلداری کرتے تو جھٹ دل پگھل جاتا ۔

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

غالبؔ نیک دل بامحبت اور شریف آدمی تھے۔ ان باتوں پر خواہ مخواہ شرمندہ ہو جاتے تو شوخی سے کہتی ۔

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں، گر آ جائے ہے، مُجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے، مُجھ سے

ایک بار کئی دن غالبؔ کی صورت نظر نہ آئی، جب آئے اور معذرت کی تو بولی ''جی ہاں، جانتی ہوں ۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

ایک بار بہت دن بعد غالبؔ نے پاؤں دبوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے موقعے بھی کبھی نصیبوں سے ہی ملتے ہیں۔ خوشی کے مارے اُس سے دباتے نہ بن رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا ''کیا بات ہے؟ کیسے دبا رہی ہو؟؟'' مسکرا کر کہا ۔

اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے
کہا جو تو نے، ''ذرا میرے پاؤں داب تو دے''

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، آپس کی یگانگت اور بے تکلفی بڑھتی گئی۔ یوں سمجھو کہ اب عشقیہ رنگ نے دوسرا رنگ پکڑ لیا۔ غالب کے شاعرانہ مزاج کا لاأبالی پن بڑھا تو بیوی کی نصیحت فضیحت بڑھی مگر ۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

اور ۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کی بادہ خواری تو سمجھ سکتی ہے بچی کہ اُن کی باخدا بیوی پر کیسی بار گزرتی ہوگی۔ غالبؔ کی وہ مشہور غزل تجھے یاد ہوگی ع

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ایک دن بڑے انہماک سے بیٹھے اسے لکھ رہے تھے۔ بیوی بھی تسبیح پھیرتی ادھر سے گزریں اور معرفت بھرے یہ شعر سُن کر بہت متاثر ہوئیں۔ غالب نے پوچھا ''کہو کیسے ہیں؟؟'' بے اختیار بولیں ۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایک بار غالب نے کعبہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، صاف صاف نہ کہہ سکی کہ یہ حرکتیں اور یہ تمنا، بس اتنا کہہ کر رہ گئی ۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب کو گردشِ زمانہ سے پریشان اور ابنائے زمانہ کے رویے سے رنجیدہ دیکھتی تو دلدہی اور دلداری بھی کرتی تھی۔ ایک بار سمجھاتے سمجھاتے آنکھ میں آنسو بھر کر بولی ۔

بے خانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان! خدا ہے

ایک شعر اُس وقت کا ہے جب غالبؔ نئے نئے جہاں پناہ کے دربار سے وابستہ ہوئے تھے۔ اُن کو چھیڑنے کے لئے کہہ اٹھیں ۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

یہ ایسی ہی محبت بھری نوک جھونک تھی جسے غالب اپنے انداز

میں اپنے خطوں میں کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے تو بیوی کو بیڑی سے تشبیہ دی تھی ناں؟ مگر تو بھی جانتی ہے اور وہ بھی جانتی تھی کہ یہ محض اُن کی شوخیِ بیان اور ظریفانہ طرزِ ادا ہے۔

تجھے بعض شعر غالبؔ کے یہاں زنانہ لب و لہجہ میں کہے ہوئے نظر آئیں گے۔ اگرچہ جو کلام میں نے تجھے اُن کی بیوی کا ابھی تک سنایا، اُس میں زنانی بولی کم ہے، غالبؔ کی صحبت کا اثر تھا ناں اس پر کبھی کبھی اپنا مخصوص رنگ جھلک اٹھتا ہے ؎

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

غالبؔ کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں

اس کے پہلے مصرعے میں تجھے کس کی بولی نظر آتی ہے؟ یہ بیوی کا مصرع ہی تو تھا جس پر گرہ لگا کر انہوں نے مطلع کر دیا اور پھر اپنی وہ مشہور غزل مکمل کی۔ ایک اور شعر خالص زنانی بولی میں اُس وقت کا ہے جب نیا نیا بیاہ ہوا تھا ؎

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

میں سب کچھ بھول کر اُن بڑی بی کی باتیں سُن رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ ذرا دیر یہ اور بیٹھ گئیں تو غالبؔ بیچارے کو جن کے دیوان کا حجم یوں ہی بہت کم ہے، بالکل تہی دست نہ کر دیں اور وہ کہے جا رہی تھیں "لیکن جب پچاس برس کا ساتھی بچھڑ گیا تو باوفا بیوی کا دل ٹوٹ گیا۔ شعر و سخن سے بھی جی بھر گیا اور سوائے اللہ اللہ کرنے کے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ غالب کے بعد اُس نے بہت کم شعر کہے۔ کبھی کبھی کراہ کے ساتھ کوئی شعر بیساختہ منہ سے نکل جاتا تھا۔ ان ہی میں سے ایک مجھے یاد آیا ؎

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
رویئے زار زار کیا؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

یا وہ شعر جو میں نے تجھے سنایا تھا، اپنا ویران گھر دیکھ کر منہ سے نکلا تھا ؎

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتی تھی میں اِک حسرتِ تعمیر بھی ہے

اور یہ شعر تو اکثر زبان پر رہتا تھا جسے تم ابھی پڑھ رہی تھیں ؎

ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۔۔۔اللہ اللہ!!

اب غور سے اُن کی صورت دیکھتی ہوں تو یا اللہ۔۔۔۔میں سکتے میں رہ گئی، یہ خواب ہے یا بیداری؟؟۔۔۔میں سوتی ہوں یا جاگتی ہوں۔۔۔۔گورا چٹا رنگ، تیکھے نقش و نگار لوہارو خاندان کا مخصوص انداز اور آبِ کوثر میں دھلی ہوئی زبان۔۔۔میرے منہ سے نکلا۔۔۔آپ۔۔۔آپ۔۔۔امراؤ بیگم۔۔۔امراؤ بیگم ۔۔۔بیگم غالبؔ؟؟؟

۔۔۔میں نے آنکھیں کھولیں۔

کھانسی کے ایک جھٹکے نے مجھے کہیں سے کہیں لا پھینکا، کوئی بازو ہلا کر کہہ رہا تھا۔۔۔۔کیا ہوا؟۔۔۔۔کیا ہوا؟۔۔۔کسے پکار رہی ہو؟؟۔۔۔کون امراؤ بیگم؟؟۔۔۔میرا سانس شدت سے پھول رہا تھا۔۔۔سینے پر دیوانِ غالب کھلا پڑا تھا۔

در پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

جیروم کے جیروم / نوید ظفر کیانی

سفر ہے شرط

باب سوئم

چنانچہ اگلے دن شام کو ہم سب دوبارہ اکٹھے ہوئے تاکہ اپنے منصوبے پر مزید بحث و تمحیض کر کے اُسے زیادہ مربعط بنایا جا سکے۔ جارج بولا۔۔۔"سب سے پہلے جو فیصلہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے ساتھ کیا لے جانا چاہئیے۔۔۔ جے! تم ایسا کرو کہ ایک ورق اٹھالاؤ، اور جارج! تم جلدی سے کیٹلاگ اُٹھالاؤ۔۔۔ اور کوئی مجھے ایک عدد پنسل پکڑا دے تاکہ میں تمام لوازمات جی فہرست تیار کرسکوں۔"

آپ ہنسئے مت۔۔۔ جارج کچھ ایسا ہی ہے، ہر قسم کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے اور پھر اُس ذمہ داری سمیت دوسروں کے کندھوں پر اُچک پڑتا ہے، پیر تسمہ پا کی طرح۔

وہ بالکل چچا پوجر کی طرح ہے۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جب چچا پوجر کوئی کوئی کام تضویض کیا جاتا تھا تو وہ تمام گھر کو کیسے اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتے تھے، ہر کوئی اپنی خیر مناتا نظر آتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ تصویروں کی دوکان سے ایک تصویر پسند کر کے لائی گئی۔ ظاہر ہے یہ بیگم پوجر کا کمال تھا۔ اب پوجر صاحب کھانے کے کمرے میں کسی جگہ اُسے آویزاں کرنے کے لئے اٹینشن کھڑے ہیں۔ شومیِ قسمت سے بیگم پوجر نے اُن سے پوچھ لیا کہ اِس تصویر کا اب کیا کرنا ہے۔ حضرت فوراً بولے۔۔۔"ارے! آپ لوگ اس بارے میں قطعاً فکر مند نہ ہوں۔۔۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں، اب یہ میرا کام ہے!"

اس کے بعد موصوف نے اپنا کوٹ اُتارا اور کام میں جُت گئے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر بازار بھیجا کہ وہ چھ عدد کیلیں لے آئے۔ اُسے روانہ کرنے کے بعد چھوٹی بیٹی کو اُس کے پیچھے روانہ کیا کہ وہ اُسے بتا آئے کہ اُن کیلوں کا سائز کیا ہونا چاہئیے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے اس کام نے مزید ہاتھ پاؤں پھیلائے اور جلد ہی سارا گھر اس کی لپیٹ میں آگیا۔

اور وِل۔۔۔ اب تم دوڑ کر جاؤ اور اسٹور روم سے ہتھوڑی اُٹھالاؤ! اور ٹام!! تم مجھے پیانہ دو!!! مجھے سیڑھی بھی چاہئیے ہوگی اور وہ اسٹیل کی کرسی بھی جو باورچی خانے میں پڑی ہوئی ہے۔۔۔ جم ! تم گوگل صاحب کی طرف جاؤ! اُنہیں میرا بہت بہت سلام کہنا اور میری طرف سے پوچھنا کہ اب اُن کی داہنی ٹانگ کیسی ہے۔۔۔ سُوجن کم ہوا کہ نہیں؟ اور پھر کہنا کہ وہ اپنا "سپرٹ لیول" تو کچھ دیر کے لئے دے دیں۔۔۔ اور ماریہ! تم کہاں چلیں؟؟ یہیں چپکی کھڑی رہو۔۔۔ کسی کو تو یہاں ہونا چاہئیے جو سیڑھی کو پکڑے رکھے تاکہ یہ سلپ ہو کر گر نہ پڑے۔۔۔ اور ہاں جب منا کیلیں لے کر واپس آئے تو اُسے دوبارہ بازار بھیج دینا۔۔۔ تصویر کو ٹانگنے کے لئے نائلون کی رسی بھی تو لانی ہے۔۔۔ اور ٹام۔۔۔ کدھر ہے ٹام۔۔۔ ٹام! ادھر آؤ۔۔۔ تم نے یہ تصویر مجھے تھمانی ہے۔۔۔ ابھی نہیں! جب میں سیڑھیوں پر چڑھوں گا، تب۔۔۔!!

اور پھر چچا پوجر نے تصویر اٹھائی لیکن جس پھرتی سے اٹھائی، اُسی پھرتی سے گرا بھی دی۔ دھچکا کھا کر تصویر فریم سے باہر کود پڑی۔۔۔ فریم کے شیشے کو بچانے کی مساعیِ جمیلہ موصوف اپنا ہاتھ زخمی

کر بیٹھے۔ اب جناب اپنے رومال کی تلاش میں سارے کمرے میں ناچتے پھرے لیکن بھلا وہ اُنہیں کہاں ملتا۔۔۔ رومال تو کوٹ کی جیب میں تھا جو وہ پہلے ہی اتار چکے تھے اور انہیں یہ بھی یاد نہیں

نہیں!!۔۔۔ میں نے اپنا کوٹ خود ہی ڈھونڈ نکالا ہے ۔۔۔ تم لوگوں کو کسی چیز کو ڈھونڈنے کا کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کاہل الوجود بلی کو چوہا پکڑنے کے لئے کہا جائے!!''

تھا کہ انہوں نے کوٹ اتار کر رکھا کہاں تھا۔ گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد جو پہلے تصویر ٹانکنے کے سامان کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے، اب چچا پوجر کے کوٹ کی تلاش میں سرگرداں تھے جبکہ چچا پوجر خود آرام کرسی پر بیٹھے انہیں مختلف جنگجوانہ ہدایات جاری کرنے میں مشغول تھے۔

حیرت ہے۔۔۔ سارا گھر لوگوں سے اٹا پڑا ہے اور کوئی یہ نہیں جانتا کہ میرا کوٹ کہاں ہے! میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا لاپرواہ گھرانا نہیں دیکھا۔۔۔ تم ساتوں کے ساتوں یہیں موجود تھے جب دو منٹ پہلے میں نے اپنا کوٹ اتارا تھا اور اب تمہیں وہی کوٹ نہیں مل رہا ہے۔۔۔ حد ہوگئی بھئی حد ہوگئی!!!

پھر وہ یک بیک اٹھے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اُن کا کوٹ تو اُس کرسی پر دھرا ہوا تھا جس پر وہ تشریف رکھے ہوئے تھے۔ کوٹ برآمد کر لیا گیا تو چچا پوجر نے فاتحانہ انداز میں کہا۔۔۔ ''چھوڑو جی چھوڑو! ۔۔۔ یہ تمہارے بس کی بات

آدھ پون گھنٹے کی جدوجہد کے بعد اُن کی انگلی پر مرہم پٹی کر دی گئی، فریم کے لئے نئے شیشے کا انتظام کر دیا گیا۔ اوزار، سیڑھی، کرسی اور موم بتی متعلقہ جگہوں پر پہنچا دی گئیں تو موصوف نے از سرِ نو عزم سفر باندھا۔ گھر کا تمام کنبہ، بمع خاتون خانہ اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے پتلے موٹے بڑے بچے اُن کے گرد دائرہ بنائے اُن کی مدد کے لئے یوں ایستادہ تھے جیسے بلے باز کے گرد فیلڈر گیند کی آس میں کھڑے ہوتے ہیں۔ دو بندوں نے مضبوطی سے اُن کی کرسی تھام رکھی تھی، تیسرا انہیں کرسی پر چڑھانے کی جدوجہد کر رہا تھا، چوتھا کیلوں کی ترسیل پر مامور تھا جبکہ پانچوں انہیں ہتھوڑی تھمانے کے لئے مستعد تھا۔

چچا پوجر نے کیل تھامی اور جیسے تھامی ویسے ہی گرا بھی دی۔

لو۔۔۔ کر لو بات۔۔۔ وہ زخمی آواز میں چلائے۔۔۔ اب کیل بھی گئی!

اب صورتحال یوں تھی کہ ہم سب گھٹنوں کے بل بیٹھے، گویا

کوشش کرنے لگے۔۔۔ہم سب کو وہ نشان مل تو گیا مگر ہر کسی دیوار پر مختلف جگہوں پر ملا۔۔۔خدا جانے اُن میں سے چچا پوجر کا لاڈلا نشان کون سا تھا؟؟۔۔۔چچا پوجر نے ہم سب کو باری باری ''احمق'' کے لقب سے نوازا اور ایک زوردار دھکا لگا کر کرسی سے نیچے اُتار ڈالا۔اب انہوں نے دوبارہ پیمانہ اٹھایا اور دوبارہ پیمائش کرنے لگے۔اُن کے خیال کے مطابق اُس مطلوبہ نشان کو داہنے کارنر سے ساڑھے اکتیس انچ داہنی طرف ہونا چاہیے تھا۔۔۔ساڑھے اکتیس یا اس سے بھی کوئی آٹھ اعشاریہ نو انچ نیچے کی طرف۔۔۔وہ فیصلہ نہ کر پا رہے تھے اور اِسی جمع تفریق میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔

ہم سب بچہ لوگ اپنے اپنے ہاتھوں سے پیمائشیں کرنے لگے، نتیجتاً ہم ساتوں نے سات مختلف ایسی جگہوں کا سراغ لگا لیا جہاں پر مفرور نشان کی گرفتاری متوقع تھی۔اختلافات سیاسی رنگ اختیار کرنے لگے اور ہم سب ایک دوسرے کو سیاسی مخلوق کی طرح آنکھیں دکھانے لگے۔ہر کوئی اپنی کہی کو حرفِ آخر قرار دے رہا تھا۔اِسی کشمکش میں پیمائش کے اصل اعداد گڈ مڈ کردیئے گئے اور چچا میاں کو نئے سرے سے پیمائش کا تردد کرنا پڑا۔

اِس بار انہوں نے ''سپرٹ لیول'' کے استعمال کو موزوں جانا اور ایک انتہائی نازک لمحے میں، جب وہ کرسی پر کھڑے ہوئے تھے اور پینتالیس کے زاویے سے جھکے ہوئے تھے اور اُس نقطے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں سے وہ لگ بھگ تین انچ کی دوری پر تھے کہ سپرٹ لیول کی رسی پھسل پڑی اور وہ لڑھکتے کر قریب پڑے ہوئے پیانو پر جا پڑے۔ایک نہایت مترنم ساز پیانو سے برآمد ہوا جس سے اُن کے کان جھنجھنا اٹھے اور کچھ لمحوں کے لئے ایسا لگا کہ جیسے انہیں خصوصی بچوں کے ادارے میں بھرتی کرانے کی حاجت پڑ گئی ہے۔

اسی موقع پر پیانو کی آواز کے ساتھ ساتھ بصد ہذیان اُن کی ذاتی زبان سے بھی ایسی صدائیں برآمد ہوئیں کہ جنہیں سُن کر چچی ماریہ بپھر گئیں اور وہیں کھڑے کھڑے اعلان فرما دیا کہ وہ بچوں کو کسی ایسی جگہ کھڑے ہونے کے حق میں نہیں ہیں جہاں

استدعا کرنے کے انداز میں، اُس چلبلی کیل کو تلاش کر رہے تھے جبکہ چچا میاں کرسی پر کھڑے ہوئے تھے اور بُڑبُڑا رہے تھے کہ کیا وہ ساری عمر یونہی کرسی پر کھڑے کھڑے گزار دیں گے؟؟

کچھ دیر بعد، بالآخر، کیل تو ڈھونڈ لی گئی لیکن اب ہتھوڑی کی کوئی خیر خبر نہ ملتی تھی۔

''یہ ہتھوڑی گئی کہاں؟۔۔۔کیا کیا ہے میں نے ہتھوڑی کے ساتھ؟؟۔۔۔غضب خدا کا!۔۔۔ایک پورا لشکرِ جرار کمرے میں دندناتا پھر رہا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ میں نے ہتھوڑی کے ساتھ سلوک کیا کیا ہے!!''

ہم سب نے ہتھوڑی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اُن کے حوالے کیا۔ اب اُن کا اور زاروں پر بس نہ چلا تو وہ نشان ہی گم کر دیا جو انہوں نے دیوار پر بنایا تھا تا کہ وہاں کیل گاڑی جا سکے۔اب ہم سب کرسی پر اُن کے ساتھ کھڑے ہو کر اُس نشان کو ڈھونڈنے کی

انہیں ایسی گفتگو سننے کو ملے۔

آخرِ کار معجزہ رونما ہو گیا اور چچا پوجر دیوار پر متعلقہ نقطہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب اُنہوں نے اُس جگہ پر اپنے داہنے ہاتھ سے کیل جمائی اور بائیں ہاتھوں سے ہتھوڑی اٹھا کر ایک کاری ضرب لگائی۔ اولین کوشش کا ہدف اُن کا انگوٹھا رہا۔ ایک دردناک چیخ کے ساتھ ہتھوڑی اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور کسی کے پاؤں پر جا پڑی۔ نتیجتاً کمرے میں شیکسپئر کے کسی ٹریجڈی ڈرامے کا دردناک ایکٹ دھرایا جانے لگا۔

چچی ماریہ نے اُن پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ''اگلی مرتبہ آپ نے جب بھی کسی دیوار پر کوئی کیل ٹھونکنی ہو تو پہلے سے بتا دیجئے گا۔۔۔ میں تیار شار ہو کر میکے چلی جاؤں گی۔۔۔ ہفتہ بھر رہنے کے بعد جب واپس آؤں گی تو غالب توقع یہی ہے کہ آپ دیوار پر کیل ٹھونکنے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے!!''

''تم عورتوں کو مذاق اُڑانے کے سوا بھی کچھ آتا ہے؟''۔۔۔ چچا پوجر بھڑک اٹھے۔۔۔ ''مجھے ہر قسم کا ٹیکنکل کام کرنا اچھا لگتا ہے اور انشا اللہ کرتا رہوں گا۔۔۔ کوئی جلتا ہے تو جلتا رہے!!''

اس کے بعد انہوں نے تیمور بادشاہ کی طرح ایک اور کوشش کی۔ دوسرے ہی وار میں کیل دیوار کے پلستر میں گڑ گئی۔ اِس غیر متوقع کامیابی پر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور کمال جوش سے آگے کی طرف جھکے، جوش اور تیزی کے غیر متوازی ربط کے باعث توازن کھو بیٹھے اور اُن کا جلوۂ مبارک دیوار سے ٹکرایا۔ اتنی زور سے ٹکرایا کہ اُن کی ناک چینی چپٹی ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔۔۔ کیل بھی محض پلستر کو لیتی ہوئی فرش بوس ہو چکی تھی۔

اب اُنہوں نے دوبارہ پیمانہ اٹھایا اور ایک اور جگہ پر نئے سوراخ کے لئے نشان بنانے لگے۔

المختصر، چچی ماریہ کی پیشگوئی کے عین برعکس، لگ بھگ نصف شب کے، تصویر ٹانگی جا چکی تھی۔ اگرچہ دیکھنے میں یوں لگتی تھی کہ اب گری کہ تب گری۔ دیوار کی حالت سے بھی محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ کمرے کی ہر شے

پژمردہ اور سسی کے شہر بھنبھور کی طرح لٹی پٹی تھی، سوائے چچا پوجر کے، جن کا چہرہ اپنی لافانی کامرانی سے کھلا پڑا تھا۔

''یہ لو!''۔۔۔ بالآخر وہ کرسی سے اترتے ہوئے فخریہ انداز سے بولے۔۔۔ ''اتنی سی بات تھی!! پتہ نہیں لوگ معمولی معمولی کاموں کے لئے باہر سے بندہ کیوں بلا لیتے ہیں؟''

ہیرس جب مزید بڑا ہو گا تو بالکل چچا پوجر کی طرح ہو گا، مجھے صد فیصد یقین ہے۔۔۔ اور میں یہ بات اُس پر واضح بھی کر چکا ہوں۔

''آخر تمہیں اتنی لیبر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''۔۔۔ میں نے کہا۔

''تم اس بات کو چھوڑو۔۔۔ وہ بولا۔۔۔ فوراً پیپر، پنسل اور کیٹلاگ کا انتظام کرو۔۔۔ اور جارج! تم نے نوٹ کرتے جانا ہے، باقی کام مجھ پر چھوڑ دو!!''

پہلی فہرست تیار کی گئی لیکن اُسے متفقہ طور پر رد کر دیا گیا کیونکہ اس فہرست کا پہلا حصہ ایسی تمام اشیائے صرف و تعیش پر مشتمل تھا جن کو ڈھونے کے لئے جس قسم کے جہاز کی ضرورت تھی، فی الحال لندن میں اس وقوع کی ٹیکنالوجی عنقا تھی۔ فہرست کو پھاڑ دیا گیا۔ اب ہم خالی خالی نظروں سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

''ہم نے بسم اللہ ہی غلط کی تھی!''۔۔۔ جارج نے بالآخر کہا۔۔۔ ''ہمیں ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہیئے جنہیں دورانِ سفر برتنا پڑے بلکہ ہمیں تو اُن چیزوں کی ضرورت ہے جن کے بغیر ہم رہ نہیں سکتے''۔

آپ حیران مت ہوں۔ بسا اوقات جارج بھی سمجھداری کی باتیں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مین اُس کی اس دانشمندی کو ''موجی دانشمندی'' کے زمرے میں ڈالتا ہوں۔ سمجھداری کی ایسی موج جو ایک خاص وقفے کے بعد ہی اُس کے دماغ کے ساحل سے ٹکراتی ہے۔۔۔ میرا بیان محض متذکرہ بحری سفر کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے سفر میں بھی اس کی دانشمندی یونہی گاہے بگاہے جھلکیاں دکھاتی رہتی ہے، مسلسل تموج میں نہیں رہتی تاہم موجودہ حالات میں اُس کی بات خاصی وزن رکھتی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو بحری سفر پر جاتے ہوئے ہر قسم کا کاٹھ کباڑ کشتی پر لاد لیتے ہیں جس سے کشتی کی عافیت ہی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ساز و سامان سے اُن کا سفر آسانی اور مزے سے کٹے گا لیکن آپ ہی ایمان سے کہئے کہ بھلا کاٹھ کباڑ سر پر لادنے سے بھی کبھی آرام ملا ہے؟

مجھے تو یہ سوچ کر ہی کوفت ہوتی ہے کہ جو حالت یہ غریب کشتی کی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اُس پر پورے کا پورا گھر لا دیتے ہیں۔ بیکار ملازمین کی فوج ظفر موج لے کر چلتے ہیں یا ایسے دوستوں کو بھی کشتی پر سوار کر لیتے ہیں جو اُن کا ٹکے کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ایسا سامانِ تعیش مثلاً زیوات، ملبوسات کے بیگوں کے بیگ اور نی جانے کیا کیا۔۔۔ سفر کی نوعیت کو دیکھا جائے تو یہ سب کاٹھ کباڑ کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے دورانِ سفر زحمت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت سہولت کے۔

ایسے تمام کاٹھ کباڑ کو عشرے پر ہی پھینک دیا جانا چاہیے۔ اِن تمام کاٹھ کباڑ سمیت کشتی کھنی پڑ جائے تو لگ پتہ جاتا ہے۔ چپو چلاتے ہوئے دست و پا شل ہو جاتے ہیں۔ بندے کو ٹینشن لگ جاتی ہے کہ کیا کرے۔۔۔ ہر قسم کے وہم گھیرنے لگ جاتے ہیں، جانے کب کیسی ہوا چلنے لگے کہ کشتی پر اپنا آپ بھی بوجھ بن جائے، ایسے میں اتنا زیادہ سامان کہاں لے جایا جائے۔۔۔ آزادی سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ بندہ فکروں سے مبرا اُن لمحات کو ترسنے لگتا ہے جن کے لئے اس نے بحری سفر کا اہتمام کیا ہوتا ہے۔۔۔ وہ موجوں پر بہتی ہوئی دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی نہیں دیکھ پاتا۔۔۔ درختوں سے چھنتی ہوئی ہزار رنگوں کی روشنی سے حظ اٹھانے کا اُسے ہوش نہیں رہتا، اُس کے اطراف میں سبز اور سنہری پتوں سے لدے پیڑ اُس کے جمالیاتی ذوق کو صدا دیتے ہوئے گزر جاتے ہیں، سفید اور زرد رنگوں کے سدا بہار کے پھول آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دیتے پھرتے ہیں۔۔۔ شام کے وقت بھاگتی دوڑتی موجوں پر رقص کرتی ہوئی دھنک۔۔۔ پانی سے سر نکال کر ''تا'' کرتی ہوئی جاذب نظر مخلوق۔۔۔ اور جانے کیا کیا۔۔۔ یہ سب کچھ دیکھنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔

کیا فائدہ ایسے کاٹھ کباڑ کا۔۔۔ اپنی زندگی کی کشتی ہمیشہ ہلکی پھلکی رکھنی چاہیے۔۔۔ رختِ سفر میں وہی کچھ باندھنا چاہیئے جس کی دورانِ سفر ضرورت پڑنے کا احتمال ہو، اتنا ہلکا پھلکا ہو کر چلنا چاہیے جیسا بندہ اپنے آپ کو گھر میں محسوس کر رہا ہو۔۔۔ ایک دو دوستوں کی ہمراہی میسر ہو تو کیا کہنا۔۔۔ ایسے دوست جو آپ سے محبت کریں یا جن سے آپ کو محبت ہو۔۔۔ کتا، بلی۔۔۔ ایک عدد پائپ۔۔۔ کچھ خورد و نوش کی چیزیں۔۔۔ چند ایک پہننے کے کپڑے اور تھوڑی بہت دل پشوری کرنے والے مشروبات۔۔۔ یہی کچھ چاہیے ہوتا ہے زندگی میں بھی اور بحری سفر میں بھی۔۔۔

افوہ۔۔۔ معاف کیجئے گا، میں تو بھول ہی گیا کہ کیا قصہ بیان ہو رہا تھا۔۔۔ فہرست کی تیاری کا کام ہم نے جارج پر چھوڑ رکھا تھا۔۔۔ اور اُس نے فہرست بنانی شروع کر بھی دی تھی۔

''ہمیں خیمے لے جانے کی ضرورت نہیں!''۔۔۔ جاج نے تجویز کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ہم ایک ایسی کشتی تیار کر لیں گے جو اوپر سے ڈھکی ہوئی ہو گی۔۔۔ یہ اہتمام مناسب رہے گا۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں، سادگی میں سہولت ہے۔۔۔!!''

یہ ایک اچھا آئیڈیا تھا چنانچہ فوراً قبول کر لیا گیا۔ آپ نے غالبًا ایسی شے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہو گی، ذرا تصور کریں کہ کشتی کے اوپر لوہے کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا جائے اور اُس پر کسی ترپال نما شے کس کر تان دی جائے، ایک چلتا پھرتا گھر تیار ہو جائے گا۔ تاہم وہ جو کہتے ہیں کہ ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں، اچھا بھی اور بُرا

بھی۔۔۔ مثلاً جب کسی سسرال گزیدہ کو اطلاع دی گئی کہ اُس کی ساس کا انتقال ہوگیا ہے تو اُس کی باچھوں کے پھیلنے سے پہلے تجہیز و تکفین کے اخراجات بھی طلب کر لئے گئے۔

جارج بولا۔۔۔'' اس صورت میں ہمیں جو چیزیں اپنے ساتھ لے کر جانی چاہئیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ایک غالیچہ
۲۔ایک لیمپ
۳۔کچھ صابن کی ٹکیاں
۴۔ایک کنگھی (مشترکہ)
۵۔دانت برش (ہر ایک کا اپنا اپنا)۔
۶۔ایک واش بیسن
۷۔ٹوتھ پیسٹ یا پاؤڈر (حسبِ خواہش)
۸۔شیونگ کا کچھ مشترکہ سامان
اور ایک جوڑا تولئے کا

میں نے یہ بات شدت سے نوٹ کی ہے کہ لوگ جب کہیں پانی کے قریب پکنک منانے یا بحری سفر پر جانے لگتے ہیں تو خاصا اہتمام کرتے ہیں لیکن جب وہاں جا کر نہانے کی باری آتی ہے تو ٹھس ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔دور کیوں جاؤ، خود میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔۔۔بحری سفر پر روانگی سے قبل، جب میں ابھی لندن میں ہوتا ہوں تو یہی سوچتا ہوں کہ میں دوران سفر علی الصباح اٹھا کروں گا اور ناشتے سے پہلے کم از کم ایک بار پانی میں غوطہ ضرور لگایا کروں گا۔۔۔ میں تو اس ضمن میں باقاعدہ باتھ سوٹ اور تولئے کا بھی اہتمام کر لیتا ہوں۔۔۔بلکہ اس کے لئے سرخ رنگ کا سوئمنگ سوٹ پسند کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں سرخ رنگ باتھ سوٹ میں اچھا لگتا ہوں۔ تاہم جب میں بحری سفر پر ہوتا ہوں تو یوں علی الصباح غسل کرنا قطعاً موزوں نہیں لگتا۔۔۔ پتہ نہیں کیوں۔

بلکہ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب میں صبح بیدار ہوتا ہوں تو غسل کا ارادہ بھی کر لیتا ہوں لیکن پھر تساہل کے باعث آخری لمحے تک بستر پر پڑا رہتا ہوں اور پھر جب اٹھتا ہوں تو سیدھا ناشتے کی میز پر پہنچ جاتا ہوں۔۔۔ایک دو مرتبہ تو یوں بھی ہوا کہ قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی اور میری آنکھ صبح چھ بجے کے لگ بھگ کھل گئی۔۔۔بلکہ میں نے شب خوابی کا لباس اتار کر غسل کے لئے تیار بھی ہونے لگا۔۔۔سوئمنگ سوٹ اور تولئے کو کندھے پر لٹکا کر دریا کے کنارے پر پہنچ گیا۔ لیکن سچ پوچھئے تو قطعاً لطف نہ آیا۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے لئے مشرق کا برفانی اور کاٹ دار ہواؤں کا انتظام کیا گیا ہو، دنیا جہان کے نوکیلے اور قاتل پتھر میرے لئے وہاں ساحل پر ایک دوسرے پر آراستہ کر دئے گئے ہوں اور پھر اُنہیں ریت سے ڈھانپ دیا گیا ہو تا کہ میری نظر اُن پر نہ پڑ سکے اور وہ مجھے بے خیالی میں جالیں۔۔۔ دریا کو ساحل سے اٹھا کر دو میل آگے رکھ دیا گیا ہو تا کہ اُس تک پہنچتے پہنچتے میرا ستیاناس ہو جائے اور جب میں یقینِ محکم، عملِ پیہم کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہوئے اُس تک پہنچوں تو لہریں بدتمیزی پر اُتر آئیں اور مجھے اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیں۔

ایک انتہائی کمینی اور گستاخ لہر شوں شوں کرتی ہوئی آئی اور مجھے اٹھا کر اُن نوک دار چٹانوں پر پٹخ دیا جسے بصد اہتمام میرے لئے وہاں آویزاں کیا گیا تھا۔۔۔ اس سے پہلے کہ میرے ہوش ٹھکانے لگتے اور مجھے ''اُفوہ'' کہنے کی فرصت ملتی، ایک اور لہر نے مجھے دوبارہ اپنے سر پر لادا اور اٹھا کر بیچ دریا میں لا پھینکا۔ میں پوری قوت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔۔۔ زندگی ایک دیوانے کا خواب لگنے لگی۔۔۔اس سے پہلے کہ میں حوصلہ ہار بیٹھتا، ایک اور لہر نے مجھے اٹھایا اور اسٹارفش کی طرح ریت پر لا پھینکا۔ میں اٹھا اور مڑ کر پیچھے دیکھا تو مجھ پر کھلا کہ میں محض دو فٹ گہرے پانی میں اپنی زندگی کی جدوجہد کرتا رہا ہوں۔ میں نے از سر نو کپڑے پہنے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا جہاں پہنچ کر مجھے اپنے دوستوں کو بتانا تھا کہ دریا میں نہانے کا تجربہ کس قدر خوشگوار رہا ہے۔

اُس وقت ہم تینوں اس طرح پُر جوش انداز میں نہانے کے لوازمات کا تذکرہ کر رہے تھے جیسے ہم نے ہر صبح تادیر سمندر میں

غسل کرنا ہو، بلکہ سمندری مخلوق ہی بن جانے کی تگ و دو کرنی ہو۔

جارج نے خیال آرائی کی کہ اس سے زیادہ پُر لطف عمل ہو ہی نہیں سکتا کہ کشتی میں کسی نو خیز صبح کو بیدار ہوا جائے اور شوخیاں جھاڑتے ہوئے دریا کے ساتھ خوش فہمیاں کی جائیں۔ ہیرس نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ صبح ناشتے سے قبل دریا کے پانی میں تیراکی کی جائے اور ہاتھ پاؤں مارے جائیں تو بھوک کھل جاتی ہے۔

''میں تو جب بھی ناشتے سے پہلے پیراکی کرتا ہوں تو ڈٹ کر ناشتہ کرتا ہوں۔''

اس پر جارج نے ہیرس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہیرس اس سے زیادہ کھاتا ہوا پایا گیا، جتنا وہ عام حالات میں کھاتا ہے تو میں اُس کے ناشتے سے قبل کی پیراکی کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہوں۔۔۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی دانتوں پسینہ آرہا ہے کہ ہمیں ہیرس کے اضافی لنگر کو بھی کشتی میں لادنا پڑے گا، اس سے جو کشتی کو چلانے کے لئے چپوؤں پر اضافی محنت اور توانائی درکار ہوگی وہ کہاں سے آئے گی؟

''لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ ہمیں ہیرس کی اس پیراکی کے بعد تروتازہ اور صحتمند دوست مل جائے گا جسے ہیرس نے تساہل اور او نگھتے لمحوں تلے دبا رکھا ہے!'' میں نے ہیرس کی بھر پور وکالت کی۔۔۔ ''کیا ہوا اگر اس کے لئے ایک دوسینکڑہ ٹن مزید بوجھ ڈھونا پڑے گا، فوائد پر بھی تو نظر ڈالو!!''

جارج نے جب مسئلے کو میرے نقطۂ نظر سے دیکھا تو وہ ہیرس کی تیراکی کے باب میں اپنا اعتراض واپس لینے پر تیار ہوگیا۔

طے پایا گیا کہ تولیوں کے تین سیٹ ہمراہ لے جائے جائیں تاکہ کم از کم تولئے کے لئے تو ایک دوسرے کو انتظار نہ کروانا پڑے۔

کپڑوں کی ضمن میں جارج نے تجویز پیش کی کہ دو دو کپڑوں کے سوٹ کافی ہوں گے۔۔۔۔ جب وہ گندے ہوں گے تو ہم دریا کے پانی میں اُنہیں خود ہی دھو دھالیں گے۔

''کیا؟ اتم نے کبھی ایسے کپڑوں کو دریا میں پہلے بھی دھویا ہے؟'' ہم نے اُس سے پوچھا۔

''نہیں! ابھی میں نے خود تو کبھی نہیں کیا لیکن میں چند ایک ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ایسا کرتے رہتے ہیں۔۔۔ اور یہ ہے بھی بہت آسان۔''

''بھئی ہمارے پلے تو کچھ نہیں پڑا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ہمارے لئے تو یہ تصور ہی مضحکہ خیز ہے کہ ہم جیسے تین معزز تین شہر، جن کو کپڑے دھونے کا تجربہ بھی نہ ہونے کے برابر ہو، واقعی اتنی صلاحیتوں کے حامل ہوں کہ ٹیمز جیسے دریا میں جائیں اور صابن لگا لگا کر اپنی پتلونیں اور شرٹیں دھوتے پھریں۔۔۔ تم کیا کہتے ہو ہیرس؟''

اُس نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر کندھے اچکائے۔

آنے والے دنوں میں ہم پر جارج کی حقیقت مزید کھلتی گئی لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ جارج غلط بیانی کی پوٹ تھا۔۔۔ اُسے کسی معاملے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا لیکن باتیں اس قدر یقین کے ساتھ کیا کرتا تھا جیسے وہ اس پر اتھارٹی ہو۔۔۔ کپڑوں کی دھلائی۔۔۔ ہوں۔۔۔ ہاں البتہ وہ اگر جرابوں کی دھلائی کے بارے میں ایسا کہتا تو اعتبار آ ہی جاتا۔

جارج نے کپڑوں کے ضمن میں اس امر پر بھی زور دیا کہ ہمیں جرابوں اور بنیانوں کے کئی جوڑے بھی ہمراہ لے کر جانے چاہئیں تاکہ اگر اکتاہٹ محسوس ہو تو چینج کے طور پر وہی تبدیل کر لیں۔ اس کے علاوہ رومال بھی بکثرت ہونے چاہئیں تاکہ چیزوں کو پونچھنے کے کام بھی آسکیں۔ اور بوٹنگ شوز کے علاوہ چمڑے کے جوتے بھی زادِ سفر میں ہونے چاہئیں تاکہ اکتاہٹ کا شکار ہوں تو کم از کم جوتے ہی تبدیل کر لیا کریں۔

جارج نے یہ نہیں بتایا کہ اگر ہم کشتی رانی سے ہی اکتا جائیں تو کہاں چھلانگ لگا دیں۔۔۔!!

ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

پروفیسر شاہد اقبال اور ایک چھپکلی کی کہانی

آج جو میں نے دیکھا۔۔ جو دیکھا اُس پر یقین آ ہی جائے گا۔۔ بات یہ ہوئی کہ آج مجھے پانچ بجے پروفیسر شاہد اقبال کا میسج ملا کہ ''مجیب میں تمہارے ساتھ ہی واک کروں گا، پلیز مجھے لے لینا۔''

حسبِ معمول میں نے اُن کو محتاط رہنے کی تاکید کی اور پھر معاہدے کی رُو سے میں اُن کو لینے اُن کے گھر گیا جو ہمارے بنگلوز سے بیس منٹ کی واک پر ہے۔ وہاں جا کر میں نے موبائل فون سے ٹیکسٹ کر دیا کہ باہر تشریف لائیے۔۔

خاصی دیر گزر گئی، پروفیسر صاحب کا نام و نشان نہ تھا۔ زمیں جنبد زماں جنبد، نہ جنبد گل محمد۔۔۔۔ الٰہی پروفیسر صاحب کہاں گئے؟

اُفوہ۔۔۔ پانچویں ٹیکسٹ پر دوسرے فلور سے شاہد اقبال کی گھبراہٹ میں غوطے کھاتی آواز اُبھری۔۔۔۔ ''مجیب ابھی آتا ہوں، ایک منٹ۔۔۔''

بارے خدا خدا کر کے پروفیسر صاحب برآمد ہوئے، علی گڑھ کٹ پاجامے، سفید بُراق کُرتے میں گلابی رنگت دمک رہی تھی۔

''کیا ہوا۔۔۔ بخار تیز ہو گیا؟''

''اوہو۔۔۔ نہیں بھئی!'' جھلا کر بولے۔

''پھر۔۔۔ ہوا کیا؟ گھر میں ٹارگٹ کلرز گھس آیا ہے؟''

''ارے بھائی وہ تو پچیس سال پہلے گھسا تھا، کوئی نئی بات کرو۔۔۔''

ڈائریکٹ خاتونِ تھانہ۔۔۔ معاف کیجئے گا۔۔ خاتونِ خانہ پر طنز تھا۔۔۔

''اوہو بھائی۔۔۔ تو ہوا کیا ہے؟'' میں بنگلے کے سامنے تیز ہوا میں ورزش کرتے کرتے اوب گیا۔

''وہ ایک چھپکلی کو ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔''

''ہائیں'' میرے سامنے کا منظر بھک سے اُڑ گیا۔۔۔

''ہاں یار پلیز پانچ منٹ بیٹھو، ابھی چلتے ہیں!''

اب جو میں اُن کی دعوت پر اُن کے گھر میں گیا تو وہ اپنے خوبصورت بیڈروم میں اس حال میں تھے کہ پورے بیڈ پر جنگ کا سا منظر تھا، ۱۸ گریڈ کی اُن کی بیگم محترمہ پروفیسر ثمینہ اقبال باقاعدہ مورچہ بند فوجی کی طرح اُس نابکار چھپکلی کو تلاش رہی تھیں جس نے

آج کی واک کا بیڑا غرق کیا تھا۔ کمرے میں ہر طرح کے کیمیکلز کی ناگوار بُو پھیلی تھی، میرے خیال میں ہر وہ اسپرے استعمال میں لایا گیا تھا جس پر گمان بھی تھا کہ وہ مردود چھپکلی کو عالمِ آب و گل سے عالمِ ارواح میں پہنچا سکتا ہے۔۔۔

''افوہ۔۔۔ حضت۔۔۔ آپ کی واک تو ہوگئی!'' میں نے اُن کو پسینے پسینے دیکھ کر چوٹ کی۔

وہ ہنسے اور بولے: ''تو پھر بیٹھو۔۔ چائے ٹھنڈا چلے گا۔۔''

وہ باتیں کرتے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ بیگم صاحبہ کے احکامات کے مطابق اُس عظیم الجثہ چھپکلی کو ڈھونڈے جا رہے تھے جو بقول اُن کی بیگم کے کالی اور خاصی بڑی تھی اور بیڈ روم مکمل طور پر سِیل کرنے کے باوجود کہیں سے ٹہلتی ٹہلاتی آنکلی تھی۔۔۔۔ مجھے ایک ۱۸ اور ۱۹ گریڈ کے گزیٹڈ پروفیسرز کو دیکھ کر شدید ہنسی کا دورہ پڑنے کو ہوا۔۔۔۔ مگر اُن کی بیگم کی وجہ سے خاموش رہا۔۔۔ اُسی میدانِ کارزار میں میرے لیے کُرسی لائی گئی۔۔

دس منٹ بعد میں نے فتویٰ دیا: ''شاہد۔۔۔ میرے خیال میں چھپکلی مر چکی ہے، جبھی تو کہیں مل نہیں رہی ہے!''

اس پر وہ مردِ خوش خُو بولا: ''ہاں یار۔۔۔ لگتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ کیونکہ اُس پر دوائیں تو ٹھیک ٹھاک پڑ چکی تھیں۔''

اتنا کہہ کر وہ از سرِ نو چھپکلی تلاشنے لگے۔۔۔

''ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا!'' اب میں بے اختیار تھا۔۔۔ اُس مرحومہ چھپکلی کی لاش تلاشنے کا مجھے کوئی شوق نہ تھا، مغرب کی اذان الگ ہونے کو تھی۔۔۔۔ میں نے اُن سے مصافحہ کیا۔۔۔ واک کی مبارک باد دی اور ایک چھلانگ مار کر اُس حسرت کدہ سے باہر نکلا جہاں پروفیسر ثمینہ اقبال صاحبہ محض ایک نابکار چھپکلی کی لاش کے دیدار کو اپنے شوہرِ نامدار کو ہلکان کر چکی تھیں۔ ہاہاہا۔۔۔۔۔۔

کیجیے ہائے ہائے کیا، روئیے زار زار کیوں؟؟؟

لیجے صاحب، چھپکلی بھی خُوب نکلی، بالکل ذہنی فرار ہو جانے والے سیاست دانوں کی طرح، پروفیسر شاہد اقبال کو ناکوں چنے چبوا دیے۔

شہرِ دہلی ہے دیارِ غالبؔ

شہرِ دہلی ہے دیارِ غالبؔ
یہیں واقع ہے مزارِ غالبؔ

کیوں نہ گلہائے عقیدت اپنے
ہم کریں آ کے نثارِ غالبؔ

وہ تھے اردوئے معلّٰی کا وقار
جس میں ہیں نقش و نگارِ غالبؔ

ہیں یہ تاریخِ ادب کا حصہ
دیکھئے قُرب و جوارِ غالبؔ

آ کے گلزارِ ادب میں دیکھیں
کتنی دلکش ہے بہارِ غالبؔ

ہوگا اقصائے جہاں میں روشن
حشر تک عزّ و وقارِ غالبؔ

آج تک اردو ادب کے برقیؔ
محسنوں میں ہے شمارِ غالبؔ

احمد علی برقی اعظمی

سید بدر سعید

ویلنٹائن ڈے

ابھی کل رات کی بات ہے کہ اسلام آباد سے ایک پروڈیوسر کا فون آیا۔ ہم نے ادب سے سلام کیا تو جواب دینے کی بجائے کہنے لگے

''بدر میاں! اگر میں مر گیا تو تم کیا کرو گے؟''

ہم نے ادب سے کہا ''سر! میں آپ کی قبر پر چاول ڈالوں گا''

کوئی اور ہوتا تو شاید غصے سے فون بند کر دیتا لیکن موصوف چونکہ شادی شدہ ہیں لہذا اس قسم کی باتیں سن کر برا نہیں مانتے بلکہ اکثر اوقات یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ

اب تو یہ حال ہے کہ جب تک کوئی دو چار سنا نہ دے کھانا ہضم نہیں ہوتا (غالباً بھابھی کا نام ''کوئی'' رکھا ہوا ہے) بس یہی وجہ تھی کہ کل بھی انہوں نے برا ماننے کی بجائے اگلا سوال داغ دیا کہ

''چاول ہی کیوں۔۔۔ پھول کیوں نہیں؟؟؟

ہم نے ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور انہیں احسن طریقے سے سمجھایا کہ فروری کے آغاز سے ہی پھول مہنگے ہو جاتے ہیں (پہلے صرف چودہ فروری کے دن ہی مہنگے ہوتے تھے لیکن جب سے عاشقوں نے پھول فریز کرنے شروع کر دیے ہیں تب سے پھول فروش بھی چلاک ہو گئے ہیں) دوسری طرف ہماری مالی حالت اتنی بھی اچھی نہیں کہ ان دنوں آپ کی قبر پر پھول رکھ سکیں۔ چاول چونکہ گھر میں موجود ہیں لہذا وہی پیش کر سکتے ہیں ویسے بھی عقیدت کے اظہار کے ساتھ ساتھ آپ کے قرض خواہوں کو ہی یقین دلانا ہے کہ آپ اب اس دنیا میں نہیں رہے، تو اس مقصد کے لیے پھولوں کا استعمال ہو یا چاول کا، کیا فرق پڑتا ہے؟؟ اور پھر آپ نے بھی کونسا باہر آ کر دیکھ لینا ہے کہ کس نے کیا رکھا ہے؟ اور اگر کسی طرح دیکھ بھی لیا تو جب دوسروں کے پھول سونگھیں گے تب ہمارے چاول بھی تناول کر لیجئے گا۔ ان دنوں پھولوں کی نسبت سستے ضرور ہیں لیکن پھر بھی پیٹ بھر دیتے ہیں

معلوم نہیں کیوں احباب نے ویلنٹائن ڈے کو محبت کی علامت بنا رکھا ہے اور اس دن اپنے محبوب کو ایک سال کے لیے گلاب کا ایک ایسا پھول دیتے ہیں جو اگلے ہی دن مرجھا جاتا ہے۔

صاحبو! ہمیں محبت کی اہمیت سے انکار نہیں کیوں کہ محبت زمانہ قدیم سے ہی پنپنے والا ایک ایسا جذبہ ہے جس پر کسی کو اختیار نہیں۔ سنا ہے کہ زمانہ قدیم میں افریقہ کے جنگلوں میں ایک ایسا قبیلہ آباد تھا جس کے عاشق اپنی محبوبہ کو پھول کی جگہ انسانی کھوپڑی دیا کرتے تھے اور وہ محبوبہ بھی چھپکلی سے ڈرنے والی آج کل کی لڑکی نہیں ہوتی تھی لہذا بہت فخر سے اس کھوپڑی میں پانی یا دودھ پیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں لوگوں کو ویلنٹائن ڈے کا علم نہ تھا شاید

اس لیے وہ ان مشکلات سے نہیں گزرے جن کا سامنا آج کل کے لوگوں کو کرنا پڑتا ہے۔آپ خود غور کریں کہ اس میں بھلا کیا مشکل ہے کہ جب دل کیا کسی کا سر کاٹ کر محبوبہ کے چرنوں میں رکھ دیا۔ویسے ہمارا ذاتی خیال یہی ہے کہ وہ سر بھی محبوبہ کے بھائی کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ اسے کاٹنا اکثر عاشقوں کی دلی خواہش ہوتی ہے

زیادہ دور نہیں جاتے ابھی 12 ماہ پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست شاہ صاحب نے کسی حسینہ کو اپنی خالص حرام کی کمائی سے خرید کر ایک عدد پھول پیش کیا جو موصوفہ کے بھائیوں نے ''خندہ پیشانی'' سے وصول کیا اور وصولی کی رسید تھما کر جناب کا رخ ہسپتال کی جانب موڑ دیا۔شاہ صاحب کے ساتھ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا لیکن اس کے نتیجے میں ہمارے ساتھ جو ہوا وہ ایک الگ کہانی ہے

ہوا کچھ یوں کہ شاہ صاحب کی حالت کا سن کر ہم نے ان کی عیادت کا سوچا۔کسی ظالم نے کہہ دیا کہ ہسپتال جاؤ تو پھول لے کر جانا چاہیے۔اس کی جو وجہ ہمیں سمجھ آئی وہ یہی ہے کہ اگر مریض مر جائے تب بھی آپ کے پھول رائیگاں نہیں جاتے۔کسی نہ کسی کام آ ہی جاتے ہیں۔پھول لے جانے کا یہ مقصد ٹھیک ہے یا نہیں اس کا تو ابھی ہمیں نہیں پتا لیکن اس دن ہمیں پھولوں کی اہمیت کا اندازہ ضرور ہو گیا۔14 فروری کا دن تھا ہم نے جس سے بھی پوچھا کہ پھول کہاں سے ملیں گے اس نے ہماری جانب ایسے دیکھا جیسے ہم نے غلطی سے پھولوں کی بجائے آٹے کا پوچھ لیا ہو۔آخر بہت سی مشکلات کے بعد معلوم ہو ہی گیا کہ شہر میں پھول کس کس جگہ دستیاب ہیں۔اب وہاں گئے تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا وہ یہ کہ کوئی بھی ہمیں درمیانہ ریٹ پر پھول دینے کو تیار نہ تھا۔ہم نے لاکھ کہا کہ حضور یہ پھول کسی محبوبہ کے لیے نہیں بلکہ ایک ٹوٹے پھوٹے عاشق کے لیے ہے لیکن کسی کو بھی ہماری سچائی پر یقین نہ آیا۔ایک شخص نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ۔۔۔ ؟''آج کے دن بھی پھول خریدتے ہوئے بحث کر رہے ہو؟''

اب ہم اس نا ہنجار کو کیا کہتے کہ اگر آج کے دن پھول خریدنے کی ہمت ہوتی تو کیا یہاں جھک مار رہے ہوتے؟

قصہ مختصر جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو مجبوراً قبرستان رخ کرنا پڑا تا کہ کسی نئے نئے مردے کی قبر سے استفادہ کر سکیں اور پھر ہمارا یہ تجربہ اس قدر کامیاب ہوا کہ ویلنٹائن ڈے سمیت حج اور دوسرے اہم موقعوں پر اسے بطور کاروبار اپنانے کا سوچ رہے ہیں

بعض دوستوں کو ہمارے اس کاروبار پر اعتراض ہے کہ یہ کام باعثِ گناہ ہے۔ان سے صرف اتنی سی گزارش ہے کہ اگر وہ اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی اتار کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ یہ ثواب کا کام ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ہم کسی قبر سے پھول چرا کر بیچیں گے تو لازماً وہ پھول دو دلوں کو راحت اور خوشی پہنچائیں گے اور ان کے درمیان نفرت ختم ہو گی اور محبت بڑھے گی جس کا ثواب ہمارے ساتھ ساتھ لازماً اس مردہ کو بھی ہوگا جس کی قبر سے ہم نے یہ پھول اٹھائے ہوں گے جبکہ اس قدر محنت کے بعد ثواب کے ساتھ ساتھ اس قبر سے اٹھائے گئے پھولوں کی رقم بطور بونس ہمیں مل جائے گی۔

سفید پوش طبقہ میں ویلنٹائن ڈے پر عموماً دو طرح کے پریمی نظر آتے ہیں ایک تو وہ جو دل سے دعا کرتے ہیں کہ اس مرتبہ پھولوں کا ریٹ کم ہی رہے جبکہ دوسرے وہ جو حالات حاضرہ سے واقفیت کی بنا پر جانتے ہیں کہ پھولوں کی قیمت کسی بھی صورت کم نہ ہوگی۔یہ لوگ صدق دل سے کسی کے مرنے کی دعا کرتے ہیں، تا کہ اس کی قبر سے پھول چرا کر محبوب کی مانگ سجا سکیں۔

ویسے بھی پھولوں کی قیمتیں جس تیزی سے اوپر کی جانب سفر کرتی ہیں انہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ آئندہ ویلنٹائن ڈے کے موقع پر جو بھی مرے گا لوگ اس کی قبر پر پھولوں کی بجائے چاول ڈالا کریں گے جس سے گورکن کے گھر بھی دال روٹی کی بجائے چاول پکا کریں گے۔!

کے ایم خالد

ایڈیٹر کی ڈاک (جدید)

ڈرون سروس بند کی جائے

مکرمی!

میں آپ کے موقر اخبار کے حوالے سے سے ارباب اقتدار کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مرکوز کروانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ کمپنیوں نے مختلف کاموں کے لے لئے ڈرون سروس شروع کر رکھی ہے۔اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ پہلے پہل تو یہ سروس ٹھیک تھی مگر اب یہ سروس ڈھیلی ہوتی جا رہی ۔پیزا، کیک اور سوفٹ ڈرنک تک تو یہ سروس ٹھیک تھی۔مگر جب سے ماڑے ہوٹل والوں نے ڈرون سروس شروع کی ہے۔بہت سی غلطیاں ان ربورٹ سے سرزد ہو رہی ہیں۔پالک گوشت کی جگہ دال اور انڈا کاری کی جگہ بھنڈیاں ہی نکلتی ہیں۔میرے ایک دن مکس سبزی کی آرڈر کے تعمیل میں ہر قسم کا آئٹم سالن میں موجود تھا جو کہ ہوٹل میں دستیاب ہوگا۔میرے خیال میں سالن کے مکس ہونے کی شکایات کی بنا پر ہوٹل والوں نے سب کے لئے ایک جیسا فقیری کھانے کا اہتمام کر دیا ہے۔اس لے علاوہ ڈرونز کے ایک دوسرے کے لوٹنے کے واقعات بھی رپورٹ ہور ہے ہیں۔ایک ڈرون کو دن دیہاڑے اس وقت لوٹ لیا گیا جب وہ ایک میلے کے لئے لنگر لے کر جا رہا تھا،اس واقعہ میں تین دیگ حلیم اور پانچ سو نان لوٹ لئے گئے۔پولیس نے مقدمہ تو درج کر لیا لیکن ابھی تک ایک بھی لنگر ڈاکو نہیں پکڑا جاسکا۔ان ڈرونز پر جو ربورٹ ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ان کی عادات بھی انسانوں کی طرح ہوتی جا رہی ہیں۔سودا پکڑانے کے بعد ایک ماہر انسان کی طرح ٹپ کے لئے ہاتھ آگے کر دیتے ہیں۔جو کہ ظاہر ہے ان کے موئے تو ندوالے سیٹھ حضرات نے ان کی پروگرامنگ میں ہاتھ اٹھانا اور ٹپ کے لئے دست سوال بلند کرنا فیڈ کیا ہوگا۔اس کے علاوہ اگر کوئی خاتون سودا پکڑنے آئے تو ہلکا سا ہاتھ اور آنکھ کو دبانا بھی انہوں نے نہ جانے کیسے سیکھ لیا ہے۔اس سلسے میں گزارش ہے کہ اس سے قبل کہ یہ ڈرون نما ربورٹ انسان بن جائیں ۔اور غیر ربورٹی سرگرمیوں میں ملوث پائے جائیں ۔اس ڈرون سروس کو یکدم بند کیا جائے۔

چودھری ڈباسنگھ چیف ایڈیٹر سہ ماہی روز نامہ ''اپنی بات''۔لکڑ پنڈ

گوند کو گاڑھا کیا جائے

مکرمی

میں آپ کے روزنامے کے ذریعے پوسٹ آفس کے اعلیٰ حکام کے علم میں ایک انتہائی اہم مسئلہ لانا چاہتا ہوں۔پوسٹ حکام کی طرف سے بار بار یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ پرائیویٹ اداروں کی بجائے پاکستان پوسٹ پر اعتماد کیا جائے اور اپنی ڈاک پاکستان پوسٹ کے ذریعے ہی روانہ کی جائے۔میں نے پاکستان کی طرف سے مہیا کردہ گوند سے خط جوڑنے کی کوشش کی۔جس کے جواب میں خط نے جڑنے سے انکار کر دیا۔ڈاک بابو نے کہا''آپ گوند ذرا زیادہ لگا دیں یہ راستے میں ہوا لگے گی تو جڑ جائے گا''۔اس خط کے جواب میں جو خط مجھے دوسری طرف سے

موصول ہوا ہے وہ بھی کھلی ہوئی حالت میں ہے۔ جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ خط کبھی رستے میں ہوا سے نہیں جڑ تا۔ یہ ڈاک بابو کی طفل تسلی ہی تھی۔ پاکستان پوسٹ کے حکام اس سنجیدہ مسئلے کو اپنی ٹاپ پرائرٹی پر رکھیں اور گوند کو گاڑھا کرنے کے احکامات جاری کئے جائیں۔

عبدالرشید۔ ریٹائرڈ سرکاری ملازم لاہور

ترکش ڈراموں کی تعداد بڑھائی جائے

مکرمی!

میں آپ کے اخبار کے طفیل ایک انتہائی اہم مسئلہ پیمرا حکام کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ آج کل نجی چینلز پر جو ترکش ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان ڈراموں کی تعداد کو فوری بڑھایا جائے۔ ناظرین گھر بیٹھے ملت اسلامیہ کے اہم ملک کی تاریخی عمارات اور عظیم سلطنت عثمانیہ کے گمگشتہ نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔ ہم تو ریشم کی آنکھوں میں ہی ڈوبے ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ رنگین لنز کے بغیر رنگ برنگی آنکھیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ جس سے دل کو ایک تسکین محسوس ہوتی ہے۔ ان ترکش ڈراموں کی بدولت ہمیں نہ صرف اپنی ازلی دشمن بھارت کی ثقافتی یلغار بلکہ انگریزی ثقافت سے بھی رہائی مل سکتی ہے۔ پاکستانی ڈراموں کی مد میں جو کروڑوں روپے فضول ضائع کئے جا رہے ہیں پیسہ بھی بچایا جاسکتا ہے۔ ترکش ڈرامے بیک وقت بھارتی ڈرامہ اور انگریزی فلموں کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں ان ڈراموں کو پاکستانی ٹچ دینے کے لئے ان میں بارش کے گانے ڈبنگ کے دوران شامل کئے جائیں کیونکہ ہماری بارشی ہیروئن فلمیں بند ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی پابند سلاسل ہیں کچھ ان کا بھی روزی رزق چل جائے گا۔ ایسا کرنے سے جو چند ایک انگلیاں تنقید کے لئے اٹھ رہی ہیں وہ بھی خاموش ہو جائیں گی۔ بلکہ ہوسکتا ہے اس بارشی ٹچ سے یہ ڈرامے ترکش ٹیلی ویژن کی دوبارہ ڈیمانڈ بن جائیں۔

جان بابو، سابقہ ممبر سنسر بورڈ

تیسری نسل کے پروگرام چینلز پر بڑھائے جائیں

مکرمی!

میں آپ کے موقر جریدے کو اپنی آواز بناتے ہوئے اپنے قوم کے ایک انتہائی اہم مسئلے کو چینلز کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ ٹیلی ویژن سکرین پر اس وقت صرف ''گانے شادیانے'' ہی ایک ایسا پروگرام ہے جو کہ ہماری نمائندگی کرنے میں مصروف عمل ہے۔ اس قبل باجی علی سلیم نے نہایت عمدہ پروگرام ''بیگم نوازش علی'' پیش کر کہ پاکستانی قوم کے دل موہ لئے تھے۔ باجی اتنے دل نشین انداز میں انگلش میں ''جانیز'' کہتی تھیں کہ میری ہم جولیاں تالیاں پیٹ پیٹ کر اس کی داد دیتی تھیں۔ نہ جانے وہ کونسی وجوہات تھیں کہ اتنا اچھا پروگرام بند کر دیا گیا۔ باجی کی انگلش دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ ہماری برادری میں صرف، باجی ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ اب چونکہ باجی ایک عام سا پروگرام ''گانے شادیانے'' اپنا ''ٹھرک'' پورا کرنے کے لئے پیش کرتی ہیں۔ ہم ساری ہم جولیاں اس کے ساتھ اپنے گھروں میں ناچتی بھی ہیں اور شور بھی مچاتی ہیں۔ ہماری برادری کی تمام چینلز سے استدعا ہے کہ کم از کم ہر چینل ہماری برادری کیلئے ایک پروگرام ضرور مختص کرے۔ تا کہ ہماری نمائندگی ہر چینل میں محسوس ہو۔ اور ہماری متفقہ رائے میں تمام پروگرام باجی علی سلیم کو دیئے جائیں۔

صادق بالم چیرمین

امراؤ سنگھ جوہر گوپال تفتہ کے عزیز دوست تھے، ان کی دوسری بیوی کے انتقال کا حال تفتہ نے میرزا صاحب کو بھی لکھا تو انہوں نے جواباً لکھا۔

''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ پچاس برس سے اوپر جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔''

محمد عاطف مرزا

جگالی

جگالی کچھ جانوروں کا خاصہ ہے۔ یہ ان کے نظامِ انہضام کا بہت اہم عمل ہے۔ گھاس کھانے والے کچھ جانور مثلاً بھینس، گائے وغیرہ چارہ کھاتے ہوئے اُسے زیادہ چباتے نہیں بلکہ ادھ پیا ہی معدے کے ایک خاص حصے میں لے جاتے ہیں، پھر کچھ دیر بعد آرام سے بیٹھ کر تھوڑی تھوڑی خوراک واپس منہ میں لا کر چباتے ہیں۔ اِس عمل کو جگالی (Rumination) کہا جاتا ہے۔ یہ تو ہو گیا جگالی کا جانوروں سے تعلق، اب ذرا سوچیے کہ یہ خاصیت اگر جانوروں کے ساتھ ساتھ حضرتِ انسان کو بھی ودیعت ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

ہونا کیا تھا؟۔۔۔بس ایک مسئلہ بڑھ جاتا انسانوں کے لیے اور اُس ایک کے ساتھ کئی اور مسائل جنم لیتے۔ مثلاً:۔۔۔

☆ بچپن سے کھانے کے آداب کے ساتھ آدابِ جگالی بھی ازبر کرائے جاتے۔ مہمانوں کے سامنے معمول کے جرائم کے ساتھ ساتھ جگالی کرنے پر بچوں کو ڈانٹ پڑتی۔

☆ بڑی بوڑھیوں کے پاس جگالی ٹھیک کرنے کے ٹوٹکے بھی ہوتے، زبیدہ آپا کے پروگرام میں لائیو کال میں جگالی کی بہتری کے لیے یا ان کے مسائل کے حل کے لیے فون آتے، اور پورا گھر ادویات، جڑی بوٹیاں ہمہ قسم پیس پیس کے شیشے کی بوتلوں میں بند کرنے میں مصروف ہو جاتا۔

☆ رشتوں کی تلاش میں اندازِ جگالی خاصہ اہم نکتہ ہوتا۔ لڑکی یا لڑکے کے باقی خوبیوں، خامیوں کے ہمراہ جگالی کرنے کے ''سٹائل'' پر گھروں میں بحث ہوا کرتی۔ کئی ایک جگالی ٹھیک نہ کرنے کے سبب نظرانداز کر دیے جاتے، ''بیوٹی کریم'' کی طرز پر کئی نسخے متعارف کرائے جاتے اور شادی سے پہلے لڑکے لڑکیاں اس بکھیڑے میں ضرور پڑتے۔

☆ ناشکرے مہمان گھر واپس پہنچ کر روایتی جملے کو ایسے کہتے، ''انہوں نے تو جگالی کے لیے بھی نہیں روکا۔''

☆ سکول کالجوں میں لیکچر کے دوران جگالی پر پابندی ہوتی، جگہ جگہ بورڈ لگے ہوتے، یہاں جگالی منع ہے۔ خلاف ورزی کرنے والوں پر جرمانہ ہوتا۔

☆ نظامِ جگالی میڈیکل سائنس میں مکمل مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا۔ اس کے اپنے سپیشلسٹ ہوتے۔ اس کے لیے پھکیاں بنانے والے حکیم بھی وجود میں آ جاتے۔ طرح طرح کی ادویات دریافت و ایجاد ہوتیں۔ کچھ ادویات کے سائیڈ ایفیکٹس نظامِ جگالی پر اثر انداز ہوتے۔ کشتوں کی طرز پر ''جگشتوں'' کا بھی

اہتمام وانتظام کیا جاتا۔

☆ خون، گردے، دل وغیرہ کی طرح لوگ جگالی کے اعضا کا عطیہ مانگتے۔ یہ اعضاء فروخت بھی ہوا کرتے۔

☆ کرکٹ میچ یا کسی کانفرنس میں نماز، کھانے، چائے کے ساتھ جگالی کا وقفہ بھی ہوا کرتا۔ البتہ ایمپائرز کو جگالی کی اجازت ہوتی۔ (تصور کیجیے کہ کرکٹ ون ڈے انٹرنیشنل میچ کے دوران لمبا سا سفید کوٹ پہنے ایک ہیٹ والا بندہ وکٹوں کے ساتھ کھڑا جگالی کر رہا ہو۔۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔۔کیسا لگے گا؟؟؟)

☆ جگالی کی بہتری کے لیے طرح طرح کی ورزشیں متعارف کرائی جاتیں۔

☆ گنز بک آف ورلڈ ریکارڈ یا ایسے اداروں کے زیادہ دیر جگالی کرنے کا عالمی ریکارڈ بنانے کے بڑے بڑے ''جگالیے'' معدہ توڑ کوشش کرتے۔

☆ دفتروں میں بھی جگالی پر پابندی ہوتی۔ اس کے لیے سموکنگ/ جگالی روم مختص ہوتا، وہ بھی صرف کھانے کے وقفے کے دوران کھلتا۔ باس کے سامنے جگالی بدتہذیبی میں شمار ہوتی۔ باس کی ناپسندیدگی کا شکار ہونے والے کی اے سی آر میں جگالی کے آداب کی عدم دستیابی ان صاحب کی نالائقی تصور کی جاتی اور انہیں ترقی کی ریل گاڑی سے اتار دیا جاتا۔

☆ اخبارات، رسائل وجرائد میں سیاست دانوں، علماء و مشائخ، کھلاڑیوں، اساتذہ، شعراء وادباء، لائق طلب، اداکاروں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے منتخب لوگوں کے انٹرویوز میں جگالی پر طرح طرح کے سوالات ہوا کرتے۔ جگالی کے کئی ''پوز'' بنا کر تصاویر کھینچی جاتیں، ٹائٹل کے لیے کسی ماہر گرافکس ڈیزائنر کی مدد لی جاتی اور فوٹو ایڈیٹنگ سوفٹ ویئرز کی مدد سے انہیں سنوار ستھرا کر چھاپا جاتا۔

☆ زبان وادب میں ناز وانداز، عشوہ وادا، زلف وابرو وغیرہ کے ساتھ ادائے جگالی پر اشعار و نثر پارے تخلیق ہوتے۔ اُس دور کا ایک تصوراتی شعر کچھ ایسا ہوتا:۔۔۔

ادائے قاتلانہ ہے ''جگالی'' کی ادا اُس کی
ہے اجلا جھاگ منہ کا اور مدھر کتنی صدا اُس کی

☆ اور کسی افسانے میں کچھ یوں ہوتا:۔۔۔

''وہ کھانا کھا کر چھت پر چلی گئی۔ سردیوں کی دھوپ میں پہنچتے ہی اُس نے سوچا کہ وہ دوپہر کو جگالی چھت پر ہی کیا کرے گی۔ پہلے سے چھت پر بچھی چارپائی پر وہ نیم دراز ہوگئی۔ اس انداز میں جگالی کا پہلا موقع تھا، اُس نے مزے سے کھانا معدے کے چوتھے حصے سے منہ میں منتقل کیا اور جگالی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ سامنے والے گھر کی چھت پر بھی کوئی اُس کی جگالی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔''

☆ ٹی وی چینلز پر لائیو ٹاک شو کے دوران جگالی کی بریک لی جاتی اور اس دوران مقوء اعضائے جگالی ادویات یا مشروبات کے اشتہار بھی دکھائے جاتے۔

☆ فلموں میں ایک منظر کا اضافہ ہوتا اور وہ ہیرو یا ہیروئین کا جگالی کرتے ہوئے مختلف انداز میں ایک عدد ''سین''۔ اس ''سین'' میں زیادہ ''کٹ'' ہوجانے کے سبب ہیرو یا ہیروئین کی صحت بھی بگڑ جایا کرتی۔

☆ اِس معاملے میں فوج اور پولیس وغیرہ والے بھی پیچھے نہ ہوتے۔ طبی معائنے میں اعضائے جگالی کے بھی ٹیسٹ ہوتے۔ کئی سادے، بے چارے ''ان فٹ'' ہوجاتے کہ ان کے

جگالی کی ''سسٹم'' میں ''فالٹ'' ہے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی (پی ایم اے) کاکول میں کیڈٹس کو میس میں جگالی کرنے کے مہذب طریقے ہمراہ چھری کانٹا سکھلائے جاتے، ڈرل سکوائر یا پی ایم اے روڈ پر جگالی کرنے کی پاداش میں سزائیں دی جاتیں۔

☆ پولیس یا سول سروسز اکیڈمی اور دیگر تربیتی اداروں میں بھی اس عمل کے لیے الگ ہال ہوتے، جہاں جگالی کے آداب سکھائے جاتے۔ پولیس والے چائے پانی کے خرچے کے ساتھ جگالی پان کا خرچہ مانگتے۔ دورانِ تفتیش ملزمان کو تشدد کے طور پر زبردستی جگالی سے روکا جاتا اور پھر ملزمان حالت غیر ہونے پر بڑے بڑے جرم قبول کرلیا کرتے۔

☆ فائٹر پائلٹس کو جہاز اُڑانے سے دو گھنٹے پہلے ہی جگالی کر لینے کا حکم ہوتا۔ کچھ پائلٹ دورانِ پرواز جگالی کرنے پر ''گراؤنڈ'' کر دیے جاتے۔

☆ مسافر جہازوں کی لنچ یا ڈنر فلائٹ میں جگالی کا انتظام کیا جاتا۔ ''کمپنی کی مشہوری'' کے لیے مشروباتِ جگالی مفت پیش کیے جاتے۔ مسافروں کو کھانا کھلانے کے بعد پائلٹ کسی خوبصورت ائیر ہوسٹس کے ساتھ ہوا کے دوش پر جگالی کیا کرتے۔

☆ بسوں میں منجن اور پھکی کے علاوہ اصلی چورن جگالی بھی فروخت ہوا کرتا اور کئی بے روزگاروں کی روزی لگ جاتی۔

☆ دورانِ سفر گاڑیوں میں تے سے جان چھوٹ جاتی مگر جگالی کی جھاگ سے دوسرے مسافر ضرور تنگ ہوتے۔

☆ کوکا کولا اور پیپسی والوں کی یہاں بھی آپس میں دوڑ لگی ہوئی ہوتی اور مشروباتِ جگالی کی تمام ورائٹی کی ڈیڑھ لٹر کی بوتل کی قیمت 65 روپے کرنے کا مشورہ دینے والے کو تلاش کر رہے ہوتے۔

میرا خیال ہے اب لفظوں کی جگالی کا وقت ہوا چاہتا ہے، ویسے بھی آئیڈیا پھسلتا لڑھکتا کہیں اور نہ نکل جائے۔ دورانِ جگالی اپنا، اپنے گردونواح کے لوگوں کا موڈ خراب مت کیجیے گا۔ ملتے ہیں ایک جگالی بریک کے بعد۔

اخبار

ایک تو یہ سمجھ نہیں آتا
لوگ اخبار چاٹتے ہیں کیوں؟
دام اپنی گرہ سے دے دے کر
یونہی ٹینشن خریدتے ہیں کیوں

نوید ظفر کیانی

روشن خیال چوہدری

انگریزوں نے بچوں کے فیوچر پلاننگ کو جانچنے کے لیے جدید دور کی ضروریات اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق امور کے حوالہ سے ساز وسامان کو یکجا کر کے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ انکے بچے مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہیں۔روشن چوہدری کے بیٹوں نے انہیں تسبیح و مصلیٰ تھمادیا کہ پیرانہ سالی میں یہ بھلا اور کیا کریں گے۔؟ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔میری کبھی ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی ۔اہل محلہ انہیں بابا روشن کے نام سے جانتے ہیں۔موصوف ''بے مہار'' خیالات کے مالک ہیں اور خیر سے چوہدری بھی ہیں، پہلوانوں کے شہر گوجرانوالہ کے کسی قریبی قصبہ میں رہتے ہیں مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ہم انہیں آر کے چوہدری کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔عرصہ ہوا انیسویں گریڈ کے بڑے سرکاری عہدے سے سبکدوش ہوچکے ہیں اور آج کل شاعری میں جھک مار رہے ہیں۔ایک روز مدیرہ سہ ماہی ''نوادر'' بیگم شاہین زیدی ڈاکٹر نظیر حسنین میموریل لائبریری لاہور کے زیر اہتمام مستحق شعراء، ادباء کی کتب اپنے خرچ پر چھاپنے کے حوالہ سے گفتگو کر رہی تھیں۔انہوں نے بتایا کہ پچھلے تین سالوں سے روشن چوہدری اپنی کتاب چھپوانے کا تقاضا کر رہے ہیں ، ایک دو مرتبہ تو وہ یہاں بھی آ پہنچے ۔ان کی ایک کتاب چند سال پہلے خزینہ علم وادب کے ناشر نے کافی محنت اور اصلاح کا بیڑا اٹھا کر اسے چھاپنے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔روشن چوہدری کا مسودہ جو چار ڈائریوں پر مشتمل تھا۔بیگم شاہین زیدی نے ان میں سے ایک ڈائری میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب چھاپنی ہے ۔میں نے ڈائری لے کر رکھ لی روشن خیال چوہدری عمر کے اعتبار سے اسی نوے کے پیٹے میں داخل ہو چکے ہیں ،شاعری اور ان کا

دور دور تک کوئی واسطہ نہیں، فون پر مترنم ہو کر نثر نما شعر سناتے ہیں ،اگر آپ شاعر ہیں اور ان کی ملنے کی تمنا رکھتے ہیں تو یہ بات دھیان میں رکھیے کہ آپ عرصہ تک کوئی اچھا شعر تو دور کی بات ہے ایک سیدھا مصرعہ بھی نہیں کہہ سکیں گے۔ میں ان کا ایک واقعہ یہاں بیان کرتا چلوں، چند ماہ پہلے وہ مجھے ملنے آئے اور لاری اڈا سے ہی واپس ہو لیے، اس بات کو تین روز گزر گئے تب ان کا فون آیا۔ ''برخودار! آپ ملے ہی نہیں میں سارا دن گھوم پھر کر واپس آ گیا تمہارا فون نمبر بھی پاس نہیں تھا وہ بھی میں گھر پہ بھول آیا تھا۔''

ایک دن مطالعہ کا سوچ کر روشن چوہدی کی ڈائری کی ورق گردانی شروع کر دی، کچی پنسل سے ہاتھوں اور پاؤں سے لکھا ہوا ،کہیں کہیں ریزر سے الفاظ کی املاء کی درستگی کی گئی تھی۔ کافی دیر میں اس شش و پنج میں مبتلا رہا کہ آیا یہ نثر ہے یا شاعری؟ ایک ایک مصرعہ میں چار چار بحروں کا نزول ''غضب لگتی ہے'' تمام مصرعے بحر سے خارج، میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بے دلی کیساتھ مسودہ ایک طرف رکھ دیا اور یوں ہم ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہونے سے محروم رہ گئے۔

اور بالآخر ہم نے انہیں علاقہ کے معروف بے وزن شاعر خواجہ انور ندیم کے ہم پلہ شاعر قرار دے دیا۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہ آئے تو میں آپ کو ثبوت کے طور پر جناب روشن خیال چوہدری کی کچھ ''انٹ شنٹ'' شاعری مشتے نمونہ از خروارے پیش کرنے کی معافی چاہوں گا، تو لیجیے ملاحظہ فرمائیں یقیناً آپ نے اس سے قبل ایسی ''الف تلف'' شاعری کا شوق نہیں پالا ہوگا۔ ان کی ایک ''پُر سپوری گجل'' کے کچھ مصرعے آپ کی زبان کے چٹخارے کے لیے، پڑھیے اور منہ مچوڑیے۔

جب سے چلے گئے ہو گلیاں اداس ہیں
میرے من مندر کی ٹلیاں اداس ہیں
یہ بات میں نہیں مانتا تھا
جال کی جدائی میں مچھلیاں اداس ہیں
پروانے اور بھنورے بھی غمگین تھے
اس چنبیلی باغ کی گلیاں اداس ہیں
تیرے ہاتھ اور پاؤں پھولے ہیں
میرے ہاتھ پاؤں کی تلیاں اداس ہیں
شام کی شفق سے خون بہہ رہا تھا
آپ کے لبوں کی ڈلیاں اداس ہیں
دوریوں کا غم کھا رہا ہے
بھنورروں کے بغیر کلیاں اداس ہیں
پردوں کا کپڑا کہاں سے لاؤں
تیرے چرخے کی نلیاں اداس ہیں

انواع و اقسام کے خیالات سے مزین اس ''گجل'' کو پڑھنے کے بعد مجھے استاد امام دین گجراتی یاد آتے رہے۔ ایسی شاعری آپ نے یقیناً اس سے پہلے نہ کبھی نہیں پڑھی اور نہ کبھی سنی ہوگی۔ ایسے شاعروں پر خدا رحم کرے۔ دیگ کا ایک چاول چکھ کر ہی ذائقہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لہٰذا میں اب اور کچھ نہیں لکھوں گا اور روشن خیال چوہدری کے اس مسودے کے بارے میں پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہے کہ وہ اسے چھاپنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا دریا برد کرنے کا......!!!

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے رک گئے، اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمکیلی سی لہر دوڑ گئی اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ "راشد صاحب، راشد صاحب، ذرا جلدی سے باہر تشریف لائیے۔" شورسن کرن۔ م۔ راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے گرد آ جمع ہوئے۔

"راشد صاحب، آپ دیکھ رہے ہیں اسے!!" منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا، "یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل! خدا کی قسم سائیکل نہیں، بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔"

حماد احمد، لاہور

ہوم ورک نہ کرنے کے "عظیم الشان" بہانے

بچوں کو روزانہ صبح سورج کی روشنی پھیلنے سے قبل ہی سکول کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ دوپہر دو بجے سکول سے واپسی ہوتی ہے تو چھ سات مضامین کے ہوم ورکس کا پلندہ بھی ان کے ہمراہ ہوتا ہے۔ رات گئے تک والدین اور طلباء کو ان ''آزمائشوں'' سے ''مشترکہ طور پر'' نمٹنا پڑتا ہے۔ اگر والدین کے پاس فہم و فراست کم اور پیسہ زیادہ ہو وہ اپنے حصے کی آزمائش ''ٹیوشن والی باجی'' کے سپرد کر دیتے ہیں۔

لیکن بیچارے بچے کیا کریں؟۔۔ بچہ تو چاہے لائق ہو یا نالائق، عقل مند ہو یا کم عقل، اسے اپنے حصے کی آزمائش سے خود ہی نمٹنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سکول کی ہر کلاس میں چند ایک بچے اپنے ہوم ورک کے ہمراہ اور باقی سب کے سب ہوم ورک نہ کرنے کی بہانے بازیوں کے ہمراہ داخل ہوتے ہیں۔

بچوں کے ہوم ورک نہ کرنے کے بہانے کس قسم کے ہوتے ہیں؟۔ اس کے لئے چند نمونے ملاحظہ کیجئے۔

☆ میں نے ہوم ورک اس لئے نہیں کیا کہ اسے ''چیک کرنے کے چکر میں'' ہر دل عزیز اور انتہائی مصروف استانی محترمہ کے کاموں کا بوجھ مزید نہ بڑھ جائے۔

☆ میں نے کل شام ہی ہوم ورک کر پیجز اپنی پاکٹ میں رکھ لئے تھے لیکن کوئی جیب کترا میری جیب میں قیمتی خزانہ محسوس کر کے ساری جیب خالی کر گیاَ

☆ آپ نے کہا تھا کہ سوال نمبر ایک سے دس تک حل کرنے ہیں۔ حل تو میں نے کر ہی لئے ہیں۔ مگر آپ نے حل کر کے یہاں ساتھ لانے کا تو نہیں کہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟۔

☆ میں نے ہوم ورک کر کے اپنی شرٹ کی جیب میں رکھا تھا لیکن امی نے واشنگ مشین میں شرٹ ڈال کر دھو دی۔

☆ میرے ابو نے غلطی سے میرے ہوم ورک نوٹس اپنے بریف کیس میں ڈال لئے اور اپنے ساتھ آفس لے گئے۔

☆ کام والی ماسی نے کوڑا کرکٹ کے ساتھ میرے ہوم ورک نوٹس بھی فالتو اور فضول سمجھ کے پھینک دئے۔

☆ میں نے کل شام ہوم ورک کر کے اپنی الماری میں رکھا تھا۔ صبح نکالنے لگا تو الماری کی چابی ہی نہیں ملی۔۔۔۔۔۔!۔

☆ کل گھر واپس پہنچ کر میں نے اچھی طرح صابن سے اپنے ہاتھوں کو اور پھر منہ کو دھویا۔ صابن میری آنکھوں میں چلا گیا۔ اس کے بعد ''چراغوں میں روشنی نہ رہی''۔ یوں رات گئے تک میں اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل نہ ہو سکا۔۔

☆ میں نے ہوم ورک اس لئے نہیں کیا کیونکہ آپ ہمیشہ سب کا خیال رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے مکمل یا اچھا ہوم ورک کرنے سے کلاس کے باقی طلباء کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں۔

☆ میں اپنے نوٹس ہاتھ سے لکھنے کی بجائے پرنٹ کرتا ہوں۔ ایک تو میرے پرنٹر کی انک ختم ہوگئی تھی۔ دوسرا میرے ''پرنٹر میں وائرس'' بھی آ گیا تھا۔ لہذا میں ہوم ورک نہیں کر پایا۔

☆ صبح سکول کے لئے گھر سے نکلا تو میری آنکھوں کے سامنے ہی ایک بچہ گھر کے قریب والی ندی میں گر گیا۔ چونکہ مجھے ''ہلکی پھلکی سوئمنگ'' آتی ہے تو اس کی مدد کے لئے میں نے بھی ندی میں چھلانگ لگا دی۔ نتیجتاً وہ بچہ تو بچ گیا لیکن میرا ہوم ورک بدقسمتی سے ندی میں ڈوب گیا۔ دوبارہ گھر گیا اور یونیفارم چینج کر کے ''جیسے تیسے'' بذاتِ خود یہاں پہنچ گیا ہوں۔

☆ صبح ابو کے ساتھ کار میں بیٹھ کر سکول کے لئے نکلا تو کار کا اے سی خراب پایا۔۔ گاڑی کے شیشے نیچے کئے تو ایک تیز ہوا کا جھونکا میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہوم ورک نوٹس کو اڑا لے گیا۔

☆ ہوم ورک؟۔ کونسا ہوم ورک؟۔ کب دیا تھا ہوم ورک؟۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ یاد آ گیا۔ کل میں پانی پینے کے لئے ''آپ سے پوچھ کر'' کلاس سے باہر گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ نے ہوم ورک دیا ہو اور وہاں سے واپس آنے کے بعد میری بورڈ پر نظر پڑنے سے پہلے ہی کسی نے بورڈ کو صاف بھی کر دیا ہو۔

☆ آپ نے کل ہوم ورک کا ''کہا'' تو بالکل بھی نہیں تھا۔ میں بورڈ پر ''لکھا'' ہوا بھی نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ کل تو میری عینک ہی گھر پر رہ گئی تھی۔

امتحان

(قطعہ بالتصویر)

سال بھر جو پڑھ سکے نہ کورس میں
امتحاں میں وہ بھلا لکھ پائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

نوید ظفر کیانی

☆ میرے بھائی نے ہوم ورک کے حل شدہ پیپر کا جہاز بنا کے اڑایا۔لیکن بدقسمتی سے اس جہاز کو ''نامعلوم افراد'' نے ''ہائی جیک'' کرلیا۔

☆ میں اپنے ہوم ورک نوٹس پر اپنا نام لکھنا بھول گیا تھا۔ نعیم نے میرے نوٹس چھین کر اور اس پر اپنا نام لکھ کے سب مٹ کروادیا (جس کلاس فیلو سے بھی اچھے تعلقات نہ ہوں، اس کا نام اس بہانے میں لے لیا جاتا ہے)۔۔

☆ صبح سکول آتے ہوئے میری ایک بچے سے لڑائی ہوگئی۔وہ پاگل، بدبخت، اور گندا بچہ آپ کے متعلق یہ کہہ رہا تھا کہ آپ سکول کی سب سے اچھی ٹیچر بالکل بھی نہیں ہیں۔میں نے مار مار کے اس کی خوب دھلائی کی۔دو چار مجھے بھی پڑ گئیں۔''اسی چکر میں'' ہوم ورک کے پیپر بھی جام شہادت نوش فرماگئے۔

☆ کل میں نے ہوم ورک مکمل کیا تو میری امی تو ماشاءاللہ کہنے اور تعریفیں کرنے سے رک ہی نہ سکیں۔انہیں اپنے اس سپوت پر بہت فخر ہو رہا تھا، جس نے اتنی عمدگی اور خوبصورتی سے ہوم ورک کیا تھا۔۔انہوں نے ''ریکارڈ'' کے لئے میرا ہوم ورک ریفریجریٹر پر چپکا کے ''محفوظ'' کردیا اور یہاں لانے ہی نہیں دیا۔

☆ میرے ابو ہوم ورک کرنے میں میری ہیلپ کرتے ہیں۔انہیں کل والا ہوم ورک سمجھ نہ آنے کی وجہ سے حل ہی نہیں کرنا آیا۔۔لہذا انہوں نے کہا کہ ''چھڈو پراں۔۔مٹی پاؤ''۔۔آپ نے ہوم ورک کرنے کے لئے جو پیپرز دیئے تھے، میں نے ابو کے کہنے پر ان پر مٹی ''پادی''۔بیشک یہ آپ خود دیکھ لیں۔(گردآلود خالی ہوم ورک پیپر ٹیچر کو دکھاتے ہوئے)۔

☆ امی ابو کو ''میرا سلطان'' دیکھنے سے فرصت نہیں مل رہی تھی۔نہ ہی انہوں نے ہوم ورک کرنے میں میری ہیلپ کی اور نہ ہی میں خود ہوم ورک کر پایا۔

☆ میرا خیال تھا کہ ویک اینڈ آگیا ہے، صبح اٹھ کے ہوم ورک کرلوں گا۔لیکن آج صبح اٹھ کے پتہ چلا کہ آج تو جمعہ ہے۔ اسی ''غلط فہمی میں'' ہوم ورک رہ گیا۔

☆ ہوم ورک کرنے سے اچھے گریڈز حاصل کئے جاسکتے ہیں۔اچھے گریڈ حاصل ہوجائیں تو سکول کے بعد اچھے کالج میں داخلہ ہوسکتا ہے۔اچھے کالج میں داخلہ ہو جائے تو گریجویٹ ہو کے نوکری حاصل ہوجاتی ہے۔نوکری حاصل ہوجائے تو نوکری سے برخاست کئے جانے کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔نوکری سے برخواست کردیا جائے تو دیوالیہ ہونے کا خدشہ ہے۔دیوالیہ ہونے سے انسان اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے۔بس اسی ڈر سے میں نے ہوم ورک نہیں کیا۔

☆ ہوم ورک کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔کل سارا دن تو ہوم ورک نہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے میں ہی ''مصروف'' گزر گیا۔

غالب کے ہاں محفل جمی تھی۔ایک شاگرد نے ترنگ میں آکر مصرع کہا۔

شراب سیخ پہ ڈالی، کباب شیشے میں

اس مہمل مصرع پر سب چونک پڑے۔چاروں طرف سے لعنت وملامت شروع ہوگئی۔مصرع کہنے والا بے چارہ گم سم سہمی فاختہ کی صورت ہر ایک کا منہ دیکھتا رہا۔۔۔۔غالب سب سنتے رہے مگر خاموش رہے۔جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو غالب نے متانت سے کہا۔ارے بھائی! آپ نے پورا شعر بھی تو سنا ہوتا۔خیر اب مجھ سے سن لیجئے۔

کسی کے آنے سے ساقی کے ایسے ہوش اُڑے

شراب سیخ پہ ڈالی، کباب شیشے میں

کائنات بشیر، جرمنی

ایک صاحب بچپن میں ہی مجھ سے خائف ہو گئے تھے۔ انجانے میں ہی۔۔۔!

آج خیال آتا ہے تو بے اختیار مسکرا دیتی ہوں۔

میرے بچپن، قریب لڑکپن کا وقت تھا۔ والد صاحب کے ایک رشتے کے ماموں ہوا کرتے تھے۔ اللہ جانے، ان کے ساتھ کیا مسئلہ تھا کہ تب ان کے نہ داڑھی تھی نہ مونچھ۔۔۔!

بھائی اور میرے لیے وہ ساری زندگی ایک مسٹری بنے رہے۔ آج کے دور کے مطابق یہ اتنی حیران کن بات نہیں کہ شاہ رخ خان، سلمان خان تک کو بھی ان چیزوں سے فراغت ہے لیکن آپ اس زمانے دور کے حساب سے سوچیں ذرا۔۔۔ جب دلیپ کمار کا دور رہا اور گلوکار کندن لال سہگل جیسی نایاب مونچھیں ہوا کرتی تھیں۔ ان سے بھی بڑھ کر اونچی ناکوں کا مسئلہ ہوا کرتا تھا اور مونچھوں کو تاؤ دینے کا دور تھا تو وہ بچارے ان لوازمات کے بغیر تھے۔۔

یقیناً ان کو بھی اس بات کا احساس کمتری تو ہوتا ہوگا، تبھی تو وہ اپنے کندھوں پر ایک بڑا چار خانوں والا رومال رکھا کرتے تھے۔ مجھے اور بھائی کو پورا یقین تھا کہ موقع محل دیکھ کر وہ اس رومال سے اپنا منہ چھپا لیتے ہوں گے۔۔۔ بہت بعد میں جا کر پتہ چلا کہ واقعی وہ اس کا یہ فائدہ بھی اٹھا لیتے تھے کہ رومال سر پر ڈال لیتے تھے اور نادانستگی میں اسی رومال کا ایک کونا دانتوں میں دبا لیتے تھے یا پھر ہاتھ کی ہتھیلی اک خاص انداز سے منہ پر رکھ لیتے تھے (جسے بعد میں ہم نے فلموں میں دلیپ کمار اور ایک ٹی وی ایکٹر کا خاص پوز بنے دیکھا) اوپر سے ان کا جسم بھی قدرے بھاری تھا۔ جس کی وجہ سے بغیر داڑھی، مونچھ کے وہ ایک موٹی، بھاری عورت کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اور جب کبھی وہ سر پر رومال ڈال کر عورتوں کی محفل میں بیٹھتے ہوتے اور اپنا ہاتھ سوچنے کے انداز میں منہ پہ رکھ لیتے تو ان عورتوں میں ایسا گھل مل جاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔۔

ایک بار وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کسی کے گھر فوتگی کا پُرسہ دینے جا رہے تھے۔ بیل گاڑی پہ عورتوں کے درمیان چوکڑی مار کر وہ راجہ اِندر بنے بیٹھے تھے۔ مٹی سے بچنے کے لیے اُنہوں نے چادر بھی اچھی طرح اوڑھ رکھی تھی۔ حسبِ معمول سر پر چار خانے کا رومال تھا جو پہلے سے بھی زیادہ اہتمام سے لے رکھا تھا۔ جس سے ان کا ماتھا بھی ڈھکا ہوا تھا۔ رومال کا ایک کونا اوپر نیچے اطراف کے دو دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ راستے میں پیدل جاتی دو عورتوں نے بھی بیل گاڑی میں بیٹھنا چاہا۔ تو ایک عورت نے بیل گاڑی پہ سوار ہوتے ہوئے ماموں کے چوکڑی مارے گھٹنے کو بری طرح ہلا کر کہا،

"اے بھین، ذرا تمیز سے تھوڑی جگہ روک کر بیٹھو نا، یہ کیا پوری گڈی مل کے بیٹھی ہو۔"

اس بات پہ ماموں بری طرح گڑبڑا گئے۔ اور باقی افسردہ بیٹھی عورتوں کو اتنی ہنسی آئی جو اُنہوں نے موقع محل کے حساب سے

بڑی مشکل سے اپنی چادروں میں منہ چھپا کر روکی اور اس کے نتیجے میں اپنی نم آنکھیں پوچھنے لگیں۔۔۔

ویسے ماموں کو اس چیز کے فائدے بھی ہوا کرتے تھے۔ انجان عورتیں بے تکلفی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں یا اُنہیں بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ لیتی تھیں۔ کبھی کبھار دھول بھی جما دیا کرتی تھیں۔۔ بلکہ سننے میں آیا تھا کہ ایک، دو نے تو بے تکلفی سے انھیں چٹکی بھی کاٹ لی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعد میں حقیقت پتہ چلنے پر انھی عورتوں کو ایک دم کرنٹ لگتا تھا اور وہ 220 وولٹیج کی بجلی کھا کر پیچھے گرتی تھیں۔

ایک بار بس میں ان کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ وہ مزے سے ایک خالی بڑی سیٹ پر بیٹھے تھے اور حسب عادت سر پر اپنا رومال ڈالا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ اپنے اسی مخصوص انداز میں منہ پر رکھا ہوا تھا۔ بس میں کچھ عورتیں سوار ہوئیں اور خالی سیٹ کی تلاش میں ان تک پہنچ گئیں اور ایک عورت نے بڑی بے تکلفی سے انھیں کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اس مکالمے کے ساتھ ان سے مخاطب ہوئی۔۔،

"اے بہن، پیچھے ہٹو اتنی بڑی سیٹ پہ اکیلی بیٹھی ہو۔۔ کیا لم لیٹ ہونے کا ارادہ ہے۔"

ایسے موقعوں پر وہ بچارے اپنے آپ کی صفائی بھی پیش نہیں کر پاتے تھے البتہ اگر فیملی کا کوئی اور ممبران کے ساتھ ہوتا تو اسے تپ چڑھ جاتا اور وہ اتنا بڑا اتکا لگانے اور غلط سمجھنے والوں کو اچھی خاصی ڈانٹ پلا دیتا،

"نظر نہیں آتا یہ بھائی ہیں، بہن نہیں۔۔"

اور ڈانٹ کھانے والے اپنی نظروں پر شبہ کر کے رہ جاتے۔

مجھے یاد ہے ایک بار جب وہ میرے ہوش سنبھالنے پر پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے تو میں نے پہلے منہ کھول کر انھیں دیکھا تھا اور پھر والد صاحب کو بتانے بھاگی تھی۔ والد صاحب اپنا کوئی کام کر رہے تھے اور میں جب تک ان تک پہنچی تو بھاگنے سے کم اور شدتِ جذبات سے میرا سانس پھول رہا تھا اور میں بار بار کہے جا رہی تھی۔،

"وہ آئے ہیں، وہ آئے ہیں، وہ آئے ہیں۔۔"

والد صاحب میرے اتنے جذباتی ہونے پر پوچھ رہے تھے،

"بھئی، کون آئے ہیں؟ کون آئے ہیں آخر۔۔"

اور میں نے بالآخر جواب دیا تھا۔،

"اباجی، پتہ نہیں وہ کون ہمارے گھر آئے ہیں جو نہ تو مرد نظر آتے ہیں نہ عورت، جن کے نہ داڑھی ہے نہ مونچھ۔۔!"

اتنی دیر میں وہ ماموں دروازے میں آن کھڑے ہوئے تھے اور اُنہوں نے بھی یہ سن لیا تھا۔۔ والد صاحب کی شرمندگی اپنی جگہ تھی اور وہ ماموں بھی اپنے کھسیانے پن میں والد صاحب سے کہہ رہے تھے،

"بچی، بڑی شرارتی ہے۔"

پھر میں نے نوٹ کیا کہ اس واقعے کے بعد وہ مجھ سے تھوڑا خائف ہی رہتے تھے، شائد میں نے ان کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سچ بول دیا تھا یا ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔۔ وہ کبھی کبھی دوسرے بچوں کو خوب ڈانٹ لگایا کرتے تھے لیکن مجھے ان سے کبھی ڈانٹ نہیں ملی۔ تو آپ سمجھ جایئے نا مجھ پر ان کی اس نظرِ عنایت اور کرم کی وجہ۔۔!

آپ لوگ کچھ اور ادھر ادھر کی نہ سوچنے لگ جائے گا۔ وہ واقعی ابو کے رشتے کے ماموں ہی تھے۔ انھوں نے شادی بھی کی تھی لیکن اولاد سے محروم تھے۔ میں اور بھائی کبھی کبھی ان کے بارے میں سوچتے ہیں کہ وہ اُس زمانے کے حساب سے بہت۔۔۔ مس فٹ۔۔۔ تھے۔ اگر وہ آج کے دور میں پیدا ہوتے تو یقیناً اُن کو اتنا زیادہ سفر نہ کرنا پڑتا۔۔

مشہورِ زمانہ ٹی وی ڈرامہ "مرزا غالب" میں اسد اللہ خاں غالب کا ایک شخص سے دلچسپ مکالمہ:

دیکھو میاں! شکایت ہم سے نہیں خود سے کرو۔ قومیں بادشاہوں سے نہیں عوام سے بنتی ہیں اور آپ اگر آج بھی کبوتر نہ اڑا رہے ہوتے تو یہ قوم کچھ اور ہوتی، یہ ملک کچھ اور ہوتا۔ جاؤ، کبوتر اڑاؤ!

محمد ایوب صابرؔ

پاپی پیٹ کا سوال

سینے اور ٹانگوں کے درمیان پھیلے ہوئے وسیع وعریض رقبے کو پیٹ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ توپ کے اس حصے کو بھی پیٹ کہتے ہیں جہاں گولا رکھا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اکثر لوگ نوالے کو گولے کی شکل میں منہ کے اندر پھینکتے ہیں۔ دراصل اس گولے کا مقصد ان چوہوں کا شکار کرنا ہے جو ہر پانچ یا چھ گھنٹوں کے بعد پیٹ میں قلابازیاں کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ مہذب زبان میں اس ''دیو اشتہا کا غلبہ'' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب روٹی کے ذریعے بھوک کا جن قابو کرنا ہے۔ روٹی سے یہ جن واقعی قابو میں آتا ہے یا نہیں، اس پر بحث کی جا سکتی ہے۔ اب اگر ہم اس کی وضاحت کریں گے تو پیٹ سے پاؤں نکالنے کے الزام میں دھر لئے جائیں گے۔ آجکل ''دھرنے والوں'' کو تو کوئی دھرتا نہیں البتہ وہ ہمارے پیچھے ڈانگ لے کر دوڑے آئیں گے۔ ''پیٹیات'' حیات و وفاتِ انسانی کا اہم سبب بنتی ہیں۔ پیٹ خالی ہو تو یہ انسان کے لئے وبالِ جان بنتا ہے اور بھرا ہو تو انسان کے لئے ''شان'' بنتا ہے۔

ارے یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ جب پیٹ پیٹھ سے لگ جائے تو ہر اک منطق سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ اربابِ اختیار کو سوچنا چاہیے کہ پیٹ کا جلا گاؤں جلانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس لئے کسی کو پیٹ کی مار دینا بہت بڑا ظلم ہے۔ جس کو دیکھو اس کا پیٹ چپاتی بنا نظر آ رہا ہے۔ بدعنوانوں کا پیٹ ہے یا بے ایمان کی قبر، سارے ملکی خزانے پیٹ میں ڈالنے کے باوجود پیٹ پر ہاتھ پھیر کر خوش ہو رہے ہیں۔ لوگ پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارہ کر رہے ہیں اور بعض بڑوں نے پیٹ میں انگارے بھرنے کا کام روز و شب جاری رکھا ہوا ہے۔ غریب فاقوں سے ننگے پیٹ ہو رہے ہیں لوگوں کو اس قدر خوراک مل رہی ہے کہ اکثریت کے پیٹ میں چوہوں کی گرہ ہو گئی ہے۔ 3 وقت روٹی کھانے ایک وقت اور ایک وقت کھانے والے فاقوں کا شکار ہو رہے ہیں۔

ایک دن میں اپنے دوست خواجہ خوانخواہ سے پوچھا کہ ہمارے ہاں 67 برس بعد بھی جمہوریت مضبوط نہیں ہو سکی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس نے کہا کہ ہماری جمہوریت ابھی نابالغ ہے۔ اسے سنِ بلوغت تک پہنچنے کے لئے آمریت کے پیٹ سے جنم لینا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ بالغ نظری کا مظاہرہ نہیں کر رہے۔ ہماری جمہوریت ہمیشہ آمریت کے نشانے پر رہتی ہے۔ اب تو ایک خود ساختہ دانشور نے دعویٰ کر دیا ہے کہ آمریت آنے کیلئے صرف 5 منٹ درکار ہیں۔ 5 منٹ میں تندور کے پیٹ میں ڈالی ہوئی روٹی بھی مشکل سے پکتی ہے پھر 5 منٹ میں جمہوریت کے پیٹ پر لات کیسے ماری جا سکتی ہے۔ ایک ایسی قوم جس نے پیٹ پر پتھر باندھ کر گزر اوقات کرنے کا عزم کر رکھا ہو، وہ پیٹ کی اتنی ہلکی کیسے ہو سکتی ہے لیکن خواجہ خوانخواہ کا استدلال ہے کہ یہ سب پاپی پیٹ کا سوال ہے۔

ایک ماہر اقتصادیات کا کہنا کہ ہمارا پیٹ ڈالروں سے پل رہا جو کبھی امداد اور کبھی قرضے کی شکل میں ہمارے پیٹ میں جاتے ہیں۔

غالبانہ گرہ

ایک بار بہادر شاہ ظفر موسم برسات سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک ایک مصرع ہوا۔۔۔

جو چلمن ڈال دی ہے آسماں نے ابر باراں کی

موصوف بہت دیر تک مصرعہ ثانی کی جستجو میں اس مصرع کو گنگناتے رہے مگر دوسرا مصرع نہ ہوسکا۔

کچھ دیر بعد حضرتِ غالب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ظفر صاحب نے انہیں دیکھتے ہی اپنا مصرع سنایا، غالب نے یہ مصرع سنتے ہی برجستہ مصرع کہکر شعر مکمل کردیا

کوئی پردہ نشیں سرگرم غسل ناز ہے شاید
جو چلمن ڈال دی ہے آسماں نے ابر باراں کی

قرضے کھا کر ہم پیٹ پر ہاتھ مار کر خوش ہو جاتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ آئندہ نسلوں کو گروی رکھ کر ہم کون سا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے چہرے پر اضطراب ہے نہ پیٹ میں کھلبلی ۔اس سے زیادہ بے حسی اور کیا ہوگی کہ ہم پیٹ کی فکر میں پیٹ کے اندر آگ بھر رہے ہیں۔

پچھلے دنوں آئی جی پولیس نے ایک حکمنامہ جاری کیا کہ سب پولیس ملازمین اپنا پیٹ چھوٹا کرلیں ورنہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ فربہ پولیس ملازمین نے چند روز خوب اچھل کود کرنے کے بعد صاف کہہ دیا کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور سینے سے نکلا ہوا پیٹ کبھی واپس نہیں آسکتے۔۔۔ وہ پیٹ جس کے اندر برسوں سے مار پیٹ کا مال جا رہا ہو، وہ اپنی اصلی حالت میں واپس کیسے آسکتا ہے؟

بچپن میں میری ماں کہتی تھیں کہ بیٹا! پیٹ کاٹو تو مکان بنتا ہے۔ میں نے کہا کہ اماں جان مکان تو اینٹ ، ریت، سیمنٹ ، سریے اور لکڑی سے بنتا ہے، اس میں پیٹ کاٹنے کا ذکر کہاں سے آگیا۔ مکان پیٹ میں نہیں زمین کے اوپر بنتا ہے۔ ماں نے کہا جب اپنا مکان بناؤ گے تو میری بات سمجھ میں آئے گی۔ میں جب بڑا ہوا تو دیکھا کہ لوگ اپنا مکان بنانے کیلئے دوسرے کی جیب کاٹتے ہیں۔ میں نے اپنے دوست خواجہ خوامخواہ کے پاس گیا اور اس سے پیٹ اور مکان کا تعلق دریافت کیا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آپ کو پوری بات سمجھا دیتا ہوں تاکہ آپ کے پیٹ کے کس بل نکل جائیں۔ خواجہ خوامخواہ کے بقول اپنا مکان بنانا ایک مشکل اور مہنگا شوق ہے۔ اس لئے جب مکان بنانا ہو تو روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ مرغ مسلّم اور نرگسی کوفتوں کو پیٹ میں ڈالنے کی کوفت برداشت کرنے سے گریز کرنا پڑتا ہے۔

ایک سابقہ حکومت نے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر عوام کے جذبات کو ابھارا تھا۔ اس نعرے کی بدولت اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد جب بھی انتخابات آتے ہیں تو روٹی کپڑا اور مکان کے مردہ گھوڑے میں جان ڈال دی جاتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ پہلی دفعہ یہ نعرہ لگا تو ساتھ کہا گیا تھا کہ ''ہم آپ کو روٹی کپڑا اور مکان دیں گے۔'' اس کے برعکس آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ ''ہم آپ سے روٹی کپڑا اور مکان لیں گے۔'' بے چارے عوام پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ایک دفعہ پھر پیٹ کے خوف سے اپنا قیمتی ووٹ نااہل لوگوں کے حق میں بیلٹ بکس کے پیٹ میں ڈال دیتے ہیں۔ بیلٹ بکس کا پیٹ بھی بنئے کی دُکان کی طرح ہر طرح کا مال ہضم کر جاتا ہے اور جب شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ووٹ اگلتا ہے تو کچھ لوگوں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بعض دفعہ بیلٹ بکس کے پیٹ سے برآمد شدہ ووٹوں کی تعداد اس حلقے کے کل ووٹوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اکثر بڑے شہروں میں بڑے ریکارڈ اسی طرح بنتے ہیں۔ اب ہارنے والوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں تو کسی سیاسی حکیم سے رجوع کریں۔

جمیل خان

شاعرِ مرحوم

(شاعروں سے معذرت کے ساتھ۔ لیکن یہ معذرت جینوئن شاعروں کے لیے نہیں، کہ یہاں اُن کا ذکر خیر نہیں ہے)

ہم کراچی میں دیکھتے ہیں کہ جس کے پاس کوئی کام نہ ہوتو وہ بی۔ کام کرنے میں لگ جاتا ہےاور جس سے یہ کام بھی نہ ہوسکے تو وہ شاعری کرنے لگتا ہے، ہمارے دوست نون کا کہنا ہے کہ یہ 'کرنا' اُس 'کرنے' سے کافی حد تک مماثلت رکھتا ہے، جس سے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔

کراچی میں شاعروں کی اس قدر بہتات ہے کہ راہ چلتے انجانے میں کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے تو اُس پتھر کے نیچے سے اکثر ایک شاعر برآمد ہوجاتا ہے۔ کہیں اگر پائپ لائن ڈالنے کے لیے کھدائی ہوتو پھر اتنے شاعر نکلتے ہیں جیسے برسات میں پتنگے نکلتے ہیں۔

کبھی کبھی کراچی میں ٹماٹروں کی اتنی افراط ہوجاتی ہے تو ان کی قیمت دس روپے کلو تک گر جاتی ہے، لیکن شاعروں کی یہاں اس قدر اور بیاندازہ افراط ہے کہ اب وہ بے قیمت ہو چکے ہیں، البتہ ان کی شاعری کی قدر و قیمت قائم ہے اور چار سے چھ روپے کلو میں فروخت ہوجاتی ہے۔

بہت سے یہاں ایسے بھی ہیں جو اپنی ساری زندگی تو 'اِدھر اُدھر' منہ مارتے رہے، لیکن جب عاقبت کا خوف لاحق ہوا تو شاعری پر منہ مارنے لگ گئے۔

کچھ شاعر ایسے ہیں جو دن رات شعروں کی جگالی کرتے ہیں، کچھ شاعر شعروں کو چیونگم کی طرح چباتے رہتے ہیں، کچھ شعروں کو چکن تکّہ سمجھ کر نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں اور کچھ شاعروں کا شعروں کے ساتھ برتاؤ بھنبھوڑ کر کھا جانے والی نوع کا محسوس ہوتا ہے۔

کچھ شاعر ایسے ہیں جن کے اشعار سے ان کی خودلذتی کی کیفیت آشکار اور ٹھرکی پن عیاں محسوس ہوتا ہے، لیکن جب نہ ہاتھوں میں دَم باقی رہتا ہے اور نہ آنکھوں میں تو پھر ایسے شاعروں کو بھی وہی مرض لاحق ہوجاتا ہے، جس میں آج کل ہمارے ملک کے بہت سے بے سُرے گلوکار مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔

کچھ شاعر اساتذہ کا سا انداز لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں شعروادب کی درس و تدریس کا گویا جنون سا لاحق رہتا ہے۔ لیکن ان کا دائرہ تدریس عموماً صنفِ نازک کے لیے وسیع اور صنفِ کرخت کے لیے تنگ ہی دیکھا گیا ہے۔

ایسے شاعر ایک وقت میں ایک ہی پر دستِ شفقت رکھتے ہیں، اگر نو آموز شاعرہ بدک جائے یا خود اُن کا ہی جی اُوب جائے تو پھر کسی اور کو زانوئے تلمیذ تہہ کرنے کا موقع دیتے ہیں، بعض کو تو سب کچھ ہی اُتار کر تہہ کردینے کا موقع فراہم کردیتے ہیں۔

ہم نے اپنے دیرینہ دوست نون سے سوال کیا کہ ایسے اساتذہ ٹائپ کے شاعر مرد شاعروں کو زانوئے تلمیذ تہہ کرنے کا

موقع کیوں نہیں دیتے، تو نون نے برجستہ جواب دیا کہ اوّل تو شرع شریف میں جائز نہیں، مزید یہ کہ شرع شریف میں اس معاملے کے مسائل بھی مذکور نہیں۔

یہاں ہم ایک ایسے شاعر کا تذکرہ پیش کر رہے ہیں، جن کی گوناگوں صلاحیتوں سے ہماری قوم اب محروم ہوچکی ہے اور وہ خود مرحوم ہوچکے ہیں۔

شاید یہ اُردو ادب کی دیرینہ روایت رہی ہے کہ کسی شاعر کی شخصیت پر اُس کے مرنے کے بعد ہی لکھا جاتا ہے، زندگی میں تو یہ اکثر ایک دوسرے پر چار حرف بھیجتے یا قافیے تنگ کرنے میں مصروف دیکھے گئے ہیں۔

شاعر مرحوم کا اصل نام تو ہمیں نہیں معلوم ہوسکا، تخلص 'احقرِ اعظم' کیا کرتے تھے۔ ہمارے دوست 'نون' کے بقول لاہور کی زبان میں اس کا ترجمہ 'فِٹے منہ' ہوتا ہے۔

مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ وہ شعر و سخن کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ یہ بات جب ہم نے نون کو بتائی تو اس نے کہا' آخر انہوں نے ایسا کیا غلط کہہ دیا؟ وہ نا صرف شعر و سخن کی گود میں پلے بڑھے ہیں، بلکہ شعر و سخن کو گدھا بنا کر اُس کے اوپر خوب دھما دھم کودے بھی ہیں۔ یہاں تک کہ شعر و سخن کو گھوڑا بنا کر اُس پر سواری بھی کی ہے۔'

اکثر لوگ مرحوم پر یہ الزام دھرا کرتے تھے کہ ابتداء ہی سے وہ اپنی غریبی سے تنگ آکر اپنے اشعار فروخت کرنے لگ گئے تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ چند نامور لوگوں نے اپنے نام سے جو کلام شائع کروایا، وہ درحقیقت اِنہی شاعر مرحوم کا تھا۔

ہمارا دوست نون لوگوں کی اس بات سے بالکل متفق نہیں ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ:

شاعر مرحوم کی تو ذاتی کوئی چیز بھی نہ تھی۔

بیوی!

مرحوم بھائی کی بیوہ تھیں۔

بچے!

آٹھ دس تو جہیز میں ملے تھے۔

ایک صدی پرانا مکان، وہ بھی اُن کا اپنا نہ تھا، سُسر مرنے کے بعد اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر گئے تھے۔

اسی طرح اُن کی شاعری بھی اُسی قدیم مکان کے تہہ خانے سے دریافت ہوئی تھی اور مرحوم نے اپنے تئیں؟

کہیں کی مٹی کہیں کا روڑا۔۔۔۔۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا کے مصداق ان غزلوں نظموں کی کھچڑی ضرور پکا دی تھی۔ یعنی ایک جیسی زمین کی کئی غزلوں کے اشعار ایک دوسرے میں یوں گڈ مڈ کر دیے کہ کسی نے یہ اشعار پہلے سے پڑھ رکھے ہوں تو وہ بھی پہچان نہ سکے۔ یہ خیال کیے بغیر کہ ایک شعر تو نصیر سومرو کے قد و کاٹھ کا ہے تو دوسرا پیدائشی بچے کی مانند دو بالشت کا۔

آخر وقت تک تو اشعار کی فروخت کا سلسلہ اس قدر دراز ہو گیا تھا کہ بعض جینوئن شاعر بھی اُن سے ملنا تو در کنار کسی محفل میں اُن کا نام لینے سے بھی کترانے لگے تھے کہ مبادا اُن کا کلام بھی مشکوک نہ سمجھا جانے لگے۔

خود کو ترقی پسند خیال کرتے تھے!

نون نے بتایا کہ اُس 'ترقی پسندی' کی اساس 'فکر' کے بجائے مال و عیال پر مبنی تھی، اس سے زیادہ ترقی پسندی کا ہلی و سستی میں ہوئی۔ وہ کہتے تھے: 'کادیا سب کچھ تو ہے پھر فکر کاہے کی!

بعد میں عیال کی ترقی مال پر غالب آتی چلی گئی۔ بہر حال انہوں نے ترقی پسندی سے منہ ہرگز نہ موڑا۔

شاعر مرحوم کا کہنا تھا کہ وہ 'عوامی شاعر' ہیں!

دراصل اُن کا نظریہ یہ تھا کہ ایسی شاعری جو عوام کے سر سے گزر جائے وہی 'عوامی شاعری' کہلائے جانے کی حقدار ہوتی ہے۔

بہت سے اشعار اُن کے زبان زدِ عام بھی ہوئے۔ دروغ برگردنِ راوی۔ یعنی راوی کے کنارے پیدا ہونے والے ہمارے دوست نون کے بقول وہ اشعار دراصل غالب؟، میر؟ اور اسی قبیل کے بیشتر شاعروں کے تھے، لیکن شاعر مرحوم نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اُن اشعار کو خود سے منسوب کیا کرتے۔

وہ اکثر اشعار کی شانِ نزول بھی بیان کرتے تھے اور سیاق و سباق کے ساتھ تشریح بھی کر دیا کرتے۔

نون کہتا ہے کہ حقیقی شاعر نے یہ شعر جس کیفیت میں بھی کہا ہو، لیکن شاعرِ مرحوم نے۔۔۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!

کو ''لوٹے'' کے لیے نشر مکرر کہا تھا۔ ''لوٹے'' کے ساتھ شاید اُن کا خاصا پُرانا رشتہ تھا، یہی وجہ رہی ہوگی کہ جب وہ کونسلر کی سیٹ کے لیے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو اُن کے بعض مخالفین نے اُن کے گھر کے سامنے بیسیوں لوٹے تاروں سے لٹکا دیے۔

شاعرِ مرحوم نے بُرا مانے بغیر وہ لوٹے محلے کی مسجد کو ہدیہ کر دیے تاکہ ثوابِ دارین حاصل ہو۔

نون کے بقول اُن کی سیاسی حکمتِ عملی بھی بے پیندے کے لوٹے کی مانند ہی رہی۔

مرحوم ابتداء میں خاصے فارغ البال تھے، لیکن اُن کی زندگی میں ایک موڑ ایسا آیا جب وہ بالکل ہی فارغ البال (گنجے) ہو گئے۔ یہ صورت ایک وعظ میں شرکت کے بعد سامنے آئی۔

واعظ نے ایک روایت بیان کی تھی، جس کے مطابق ایک مسلمان جب غسلِ خاص کرتا ہے تو اُس کے بدن سے گرنے والے پانی کے ہر قطرے سے ایک فرشتہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ تا قیامت اُس کے لیے مغفرت کی دعا کرتا رہتا ہے۔

اس روایت کا سننا تھا کہ فرشتوں کی وہ افزائش شروع ہوئی کہ اُن کی بیوی نے پناہ مانگ لی۔

لہٰذا دوسری شادی کی گئی، پھر تیسری، پھر چوتھی۔ فرشتوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے کا دل میں تو حوصلہ موجود تھا، جسم میں نہیں!

اس سے پہلے کہ وہ پہلی کو رخصت کر کے پانچویں لا کر چار کا کورم پورا کرتے، حسرتِ ناتمام لیے دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔

جدید ٹیکنالوجی زندہ باد

خرم بٹ

چاند سی بہو درکار ہے

ہمیں اپنے چاند سے منجھلے بیٹے کے لیے ایک مرتبہ پھر رشتہ درکار ہے۔ متوقع سمدھیوں اور ہمارے قیمتی وقت کے پیش نظر ہم اپنی ہونے والی بہو کا خاکہ بیان کیے دیتے ہیں ۔ تاکہ صرف سنجیدہ امیدواران سمدھی ہی ہم سے رابطہ استوار کر سکیں اور فریقین اول و دوئم کسی بھی ذہنی الجھن اور دلی رنج سے محفوظ رہیں۔ ہمیں اپنے بیٹے کے لیے پڑھی لکھی بیس سے پچیس سال کی کنواری دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے ۔ جو خوبصورتی و خوب سیرتی کی گویا ایک زندہ مثال ہو۔ ہماری متوقع بہو دراز قد گوری اپسرا کی مانند خوبصورت ہو۔ بہو کی گہری جھیل نما خوابیدہ آنکھیں بڑی بڑی جن میں گلابی ڈورے اُن کے خمار میں اضافہ کر رہے ہوں۔ اسکی ناک ستواں ہو اور ایسی ناک ہو جسکے باعث ہماری ناک معاشرے میں اور اونچی ہو سکے۔ بہو کے ہونٹ رسیلے گلاب کی پنکھڑیوں سے ہوں۔ جن پر اگر مسکراہٹ گہری ہوتی

ہوئی محسوس ہوں۔ اس کی زبان شیریں ہو۔ الفاظ چن چن کر ایسے ادب آداب سے بولتی ہو کہ سننے والے پر سحر طاری ہو جائے۔ بہو سرو قد ہو اور پتلی لچکیلی کمر کے ساتھ ہرنی جیسی چال ہو۔ صفائی پسند ایسی کہ پیروں کی ایڑیوں سے بھی روشنیاں پھوٹتی ہوئی دکھائی دیں۔ بہو تمام تر حسن زنانہ کی حامل پری نما نازک بدن ہو۔ شفاف ایسی کہ چھو لینے پر میلی ہو جانے کا امکان ستانے لگے۔۔۔

ہماری بہو حور سی خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرتی میں بھی اپنی مثال آپ ہو۔ سسرال کی عزت کو ملحوظ خاطر رکھنے کے ساتھ ساتھ گھر گرہستی کے فن میں بھی طاق ہو۔ نوکر ہونے کے باوجود گھر کی جھاڑ پوچھ اور صفائی ستھرائی خود کرنے کو ترجیح

جائے تو سفید چمکتے دانت سچے موتیوں کی لڑی کی طرح اچانک نمایاں ہو جائیں۔ اسکا رنگ سنگ مرمر کی طرح سفید ہو۔ اور گالوں پر لالی ایسے پھوٹے جیسے قندھاری انار رکھ دیا گیا ہو۔ بہو کے بال اندھیری رات کی طرح لمبے گھنے اور کالے ہوں۔ اور سلکی ایسے کہ دوپٹے کے ساتھ ساتھ ہمارے بیٹے کی نظر بھی پھسلتی ہی جائے۔ اسکی دھیمی آواز ایسی ہو کہ بولنے پر گویا چڑیاں چہچہاتی

دے۔ کھانے پکانے میں اس کا ثانی نہ ہو اسکا بنایا ہوا کھانا کھانے والا اپنی انگلیاں چبا ڈالے۔ ساس سسر اور خاوند کی ایسی فرمانبردار کہ نوکر خاص کا گماں گزرے۔ نندوں دیوروں سے ایسی شفیق ہو کہ بھابھی نہیں بلکہ حقیقی ماں کا رتبہ یاد دلا دے۔ کردار کی ایسی پختہ و پاکباز ہو کہ کبھی کسی نامحرم مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔۔۔ ڈسپلن میں اتنی پکی کہ تمام کاموں کے دوران صوم

صلوات کے لیے بھی وقت نکال لیا کرے۔سسرالی رشتہ داروں کی تقریبات میں یوں مسکراتے چہرے اور اخلاق سے شریک ہوا کرے کہ خاندان والے شریک سب اندر سے جل بھن کر احساس محرومی کا شکار جائیں۔لیکن چھوٹے منہ ہماری تعریفیں کرنے پر مجبور ہوں۔ یہاں ایک بات بتانا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے۔اور ہم جہیز کو لعنت سمجھتے ہیں۔ لیکن نبی ﷺ نے بھی اپنی بیٹی کو شادی میں ضرورت کی چند چیزیں دیں تھی۔سو انکی اس سنت کو زندہ کرنا ہم کارِ ثواب اور باعث برکت سمجھتے ہیں۔۔ یہ اور بات کہ آج کے موجودہ دور میں انسان کی ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔ چٹائی کی جگہ اب کارپٹ اور چنیوٹی فرنیچر نے لے لی ہے۔ سپرنگ میٹرس، کراکری، فریج، ایل ای ڈی، واشنگ مشین یونٹ، کچن اوون سسٹم وغیرہ تو نہایت ضروری ہوتے ہیں۔۔۔۔اور سب سے بڑھ کر گاڑی تو آج کے دور کی اہم ترین ضرورتوں میں سے ایک ہیں۔جہیز ایک لعنت ہے لیکن اگر کسی نے مذکورہ استعمال کی ضروری چیزیں اپنی بیٹی کو دینی ہیں تو یہ اسکا فرض بنتا ہے۔آخر پھول سی پیاری بیٹی کا کیا اتنا بھی والدین پر حق نہیں۔۔۔

یہاں ہم اپنے خاندان اور بیٹے سے متعلق بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔الحمد اللہ ہمارے خاندان کا شمار شہر میں متوسط درجے کے ایک کھاتے پیتے عزت دار بزنس مین خاندانوں میں ہوتا ہے۔ ہمارا بیٹا بزنس میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ ماشااللہ باپ کا اتنا چلتا کاروبار تھا سو بیٹے نے آٹھویں جماعت میں سکول چھوڑ دیا تھا۔ویسے بھی ہم نے کونسی نگوڑی نوکری کروانی تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بیٹے کی یہ دوسری شادی ہوگی۔لیکن ابھی ہمارا بیٹا پینتالیس سے کیا ہی زیادہ ہوا ہوگا۔لیکن شاہانہ رہن سہن، خوش خوراکی اور بے فکری کے باعث تیس سے زیادہ کا دکھائی نہیں دیتا۔جیسا کہ تصویر میں بھی نمایاں ہے۔۔(یہ تصویر دس سال پرانی نہیں بلکہ بالکل نئی بنوائی گئی ہے)۔ہمارے بیٹے کا قد بالکل اپنے دادا پر گیا ہے۔ویسے بھی پانچ فٹ کا قد درمیانہ قد میں شمار ہوتا ہے۔ ماشااللہ صحت مند ہے مردانہ وجاہت کا نمونہ۔۔۔اور ٹانگ میں جو لنگڑاہٹ ہے وہ تو نگوڑ ماری ہماری پولیس کی وجہ سے۔جس نے کوٹھی میں شغل مغل لگاتے ہوئے لڑکوں کی محفل پر قمار بازی کا الزام لگا کر چھاپہ مار دیا۔ہمارا لاڈلا ڈر کے مارے چھت پھلانگا تو پچھلی گلی میں گرا۔بس اسی وقت جو ٹانگ ٹوٹی تو آج تک ہلکی سی لنگڑاہٹ ہے۔لیکن اس پر یہ لنگڑاہٹ گویا سج سی گئی ہے۔ یہ اپنی چال کی بدولت ہزاروں میں ممتاز نظر آتا ہے۔رنگ کالے کی بات بھی غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے۔۔مرد گورے چٹے کیا ہی اچھے دکھائی دیتے ہوں گے کہ جتنی کشش سانولی رنگت میں ہے،اور اگر کوئی اسے کالا رنگ کہے بھی تو یہ تو دیکھے کہ کتنا چمکدار رنگ ہے۔بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہمارا بیٹا مئے نوشی کرتا ہے، بھی درست نہیں۔۔ ۔ارے اگر شادی بیاہ ۔۔ تقریبات یا کبھی اچھی سیل ہونے پر تھوڑا بہت انجوائے کر لیتا ہے تو کیا اسے مئے نوشی کہیں گے؟ توبہ ہے۔۔۔اور دوسری بات یہ کہ یہ تو اتنا نفیس ہے کہ کبھی۔۔ دیسی۔۔ کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔ہمیشہ ولائتی ہی پیتا ہے۔اور صفائی پسند اتنا کہ کئی بار تھوڑی بہت پی کر گلی یا سڑک میں جو گرا تو کیچڑ لگے ان کپڑوں کے دھوبی سے دھل کر آنے پر بھی کبھی دوبارہ نہ پہنا۔ پہلی بیوی کے ساتھ اسکی مار پیٹ کے قصے تو سراسر جھوٹے ہیں۔مرد بارعب ہی اچھے لگتے ہیں۔یہ کیا کہ ہر وقت بیوی کا دم چھلا ہی بنے رہیں۔جہاں پیار ہوتا ہے وہاں غصہ بھی تو ہوتا ہے۔کبھی کبھی اگر گالی گلوچ کر دے یا دو تین ہاتھ ہی رسید کر دے تو کیا ہوا۔یہ تو محبت ہی کا ایک پہلو ہوا۔۔۔محبت میں سختی بھی تو ہوتی ہے۔تو کیا ہم اسے مار پیٹ کہیں گے۔۔اور ہمارا معاشرہ تو بات کا بتنگڑ ہی بنا دیتا ہے۔۔۔ ناچنے والیوں کے پاس جانے کا بھی سن لیں۔۔ارے یہ تو شوق ہی نوابی ہے۔۔آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں کیسے بڑے بڑے لوگوں نے ادب آداب انہیں ناچنے والیوں کے پاس جا کر سیکھا تھا۔۔۔ یہ اور بات کہ آج کی نگوڑی ناچنے والیوں میں ذرا بھی ادب آداب کا لحاظ نہیں۔۔۔لیکن ہمارا بیٹا تو صاف نیت سے ہی جاتا ہے۔۔رہی بات دوسری شادی کی تو یہ عین مذہب کے مطابق ہی تو ہے۔ ہمارے مذہب نے اسکی اجازت بھی دے رکھی

ہے۔۔اور ویسے بھی ہمارا بیٹا کون سا گیا گزرا ہے۔ پستہ باداموں سے ہر وقت جیبیں بھری رکھتا ہے۔اور پھکے مار ما کھاتا ہے۔اور ابھی بھی بیسیوں جوانوں کو پیچھے چھوڑتا ہے۔ہم نے اپنے خاندان اور بیٹے کے اعلیٰ کردار اور عزت دار ہونے کے بارے میں اس لیے اس اشتہار میں سب لکھ چھوڑا ہے کہ صرف دیانت دار اور سلجھے خاندان رابطہ کریں۔

اشتہار کی طوالت سے بھی بہت سے امیدواران سمدھیوں کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمیں مال و دولت کی کوئی پرواہ اور ہوس نہیں بلکہ ہم صرف اپنے منجھلے بیٹے کے لیے ایک اور اچھا سا خاندانی اور عزت دار رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔۔کہ ہمیں اپنے فرمانبردار اور اعلیٰ کردار بیٹے کی دوسری شادی کے لیے چاندنی بہو درکار ہے۔

تمہاری رائے تو اِس شاعری پر
ذرا بھی عقل پر مبنی نہیں ہے

ہمہ پہلو اِسے تم کہہ رہے ہو
مجھے تھری ڈی بھی یہ لگتی نہیں ہے

نوید ظفر کیانی

مقصد حاصل ہو گیا۔۔

غالب کی مفلسی کا زمانہ چل رہا تھا، پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی اور قرض خواہ مزید قرض دینے سے انکاری تھے۔ نوبت ایں جارسید کہ ایک شام اُن کے پاس پینے کے لیے بھی پیسے نہ تھے، مرزا نے سنِ شعور کے بعد شاید ہی کوئی شام مئے کے بغیر گزاری ہو، سو وہ شام اُن کے لیے عجیب قیامت تھی۔

مغرب کی اذان کے ساتھ ہی مرزا اٹھے اور مسجد جا پہنچے کہ آج نماز ہی پڑھ لیتے ہیں۔ اتنی دیر میں اُن کے ایک دوست کو خبر ہو گئی کہ مرزا آج "پیاسے" ہیں۔ اُس نے جھٹ بوتل کا انتظام کیا اور مسجد کے باہر پہنچ کر وہیں سے مرزا کو بوتل دکھادی۔

مرزا وضو کر چکے تھے، بوتل کا دیکھنا تھا کہ فوراً جوتے پہن مسجد سے باہر نکلنے لگے۔ مسجد میں موجود ایک شناسا نے کہا ۔۔۔''مرزا ابھی نماز پڑھی نہیں اور واپس جانے لگے ہو۔''

مرزا نے کہا۔۔۔''قبلہ جس مقصد کے لئے نماز پڑھنے آیا تھا وہ تو نماز پڑھنے سے پہلے ہی پورا ہو گیا ہے اب نماز پڑھ کر کیا کروں گا۔''

مولانا حالؔی کی کتاب ''یادگارِ غالب'' سے ایک اقتباس

عامر راہداری

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

جہنم میں میرا تیسرا دن تھا۔ میں بہت کوششوں کے باوجود بھی جہنم کی دیوار نہیں پھلانگ پا رہا تھا۔ عجیب پاکستانی قسم کی جہنم تھی، ہر طرف چیخ پکار، گھپ اندھیرا، آگ اور سریے (وہاں بھی "اتفاق فاؤنڈری" کا سریا دیکھ کر میاں برادران کی "پہنچ" کا اندازہ ہوا)۔ خیر پہلا دن تو اسی بوکھلاہٹ میں گزر گیا کہ میں واقعی مر چکا ہوں یا ابھی پاکستان میں ہوں۔ شاید ابھی قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک طرف سے ایک قافلہ آ رہا ہے جس نے مختلف بینرز اٹھائے ہوئے ہیں۔ قافلہ قریب آیا تو بینرز پر نظر پڑی۔ "کافر کافر شیعہ کافر"، "یہودی لابی کا بائیکاٹ"، "چارلی ہیبڈو مردہ باد" اور ان جیسے دیگر پوسٹرز پر نظر پڑی ہیں۔ جہنم میں نیا ہونے کی وجہ سے مجھے ابھی فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی کہ ان کے ساتھ چلنا "جہنم کے فرائض" میں شامل ہے یا نہیں، اس لئے چھپ جانا بہتر سمجھا، ادھر ادھر دیکھا تو دیوار کے ساتھ ایک جھاڑی نظر آئی فوراً چھلانگ لگائی اور احتیاطاً دیوار کی طرف منہ کر لیا تا کہ کسی کی نظر پڑے بھی تو مجھے "مصروف" سمجھے۔ جونہی دیوار کی طرف دیکھا ایک اور جھٹکا لگا۔ دیوار پر جلی حروف میں لکھا تھا "یہاں پر پیشاب کرنے والا کتا ہے" میں نے فوراً منہ دوسری طرف کر لیا حالانکہ جہنم میں کیا کتا کیا بندہ، قافلہ گزرا تو پیشتر اس کے کہ کوئی مجھے کتا سمجھے، میں جھاڑی سے باہر آ گیا۔ میری سوچیں جہنم کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ میں انہی سوچوں میں تھا کہ دو لمبے تڑنگے انسان نما فرشتے میرے قریب آئے۔ پہلے تو میں نے بھاگنے کا سوچا لیکن ان کے قد کاٹھ دیکھ کر اخلاقاً ارادہ ترک کر دیا. میں نے بھرپور مودب بننے کی اپنی سی کوشش کی۔ میں سر اوپر کر کے ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ شاید ان کو ترس آ گیا اور انہوں نے پلک جھپکتے ہی اپنے قد چھوٹے کر لئے۔

ایک فرشتہ میرے قریب آیا اور عجیب سے آواز میں کچھ بولا (شاید عربی زبان تھی جس کی آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی) میں نے اس کا پھنکارتا ہوا چہرا دیکھا تو نہ سمجھ آنے کی باوجود اس کو جواب دیا "جی میری امی کا نام آمنہ ہے" (میں نے سن رکھا تھا مردے امیوں کے نام سے اٹھائے جائیں گے) میرا جواب سن کر دونوں فرشتوں کے منہ سے ہنسی کے فوارے نکل پڑے۔

میں حیران پریشان ان کو دیکھنے لگا. طوفان تھما تو دوسرے فرشتے نے پہلے کو پھر کچھ عربی میں کہا جو میرے سر سے میرا کی انگریزی کی طرح گزر گیا۔

پہلا فرشتہ پھر بولا "۔۔۔اچھا تو تم بھی پاکستانی ہو؟"

"جی الحمدللہ!" میں منمنایا۔

"اچھا ہاتھ آگے کرو ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تمھیں کونسی سزائیں ملی ہیں" دوسرا فرشتہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

میں نے اس کا کرخت چہرا دیکھا تو فوراً ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر بٹوا ٹٹولا۔

"کیا دیکھ رہے ہو جیبوں میں۔۔۔ ہمیں کیا پاکستانی پولیس

سمجھ لیا ہے جو رشوت دینے کی سوچ رہے ہو..؟" پہلا فرشتے کی پھنکارتی ہوئی آواز آئی۔

میں نے ارادہ ترک کر دیا۔

"نہیں! میں تو پسینہ صاف کرنے کے لئے رومال نکال رہا تھا" میں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے ان کی تصیح کی۔

"بیٹا تم پاکستانی جہنم میں بھی جھوٹ بولنے سے نہیں کتراتے اس لئے اب جھوٹ سے اجتناب کرنا ورنہ سزاؤں میں اضافہ ہوتا جائے گا"۔

پہلے فرشتے نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور دوسرے فرشتے نے جھٹ سے کاپی پینسل نکال لی۔

"لکھو، نام عامر راہداری، پانچ سال گرم سریوں کا بستر، پانچ سال آگ میں جلنا، دس سال بچھوؤں اور سانپوں کے درمیان گزارنا، دس سال طاہر شاہ کا گانا" آئی ٹو آئی" سننا، پانچ سال علی عظمت کی چیخیں سننا اور دو سال میرا کو انگلش سکھانا۔۔۔"

"پانی ملے گا تھوڑا سا" مجھے اپنے حلق سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔

"اونچا بولو"۔۔۔فرشتے نے کرخت لہجے میں حکم صادر فرمایا۔

"جی پانی پینا ہے"۔۔۔میں اپنی آواز سن کر تھوڑا حیران سا تھا۔

"چلو ہمارے ساتھ!!" دونوں فرشتے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر چلنے لگے۔ میں نے ان کے ساتھ چلنا غنیمت سمجھا اچانک ایک مانوس سے آواز سنائی دی "چلی ساہواں دی ہنیری دوانا رہل گئے" آواز سامنے سے آ رہی تھی. بڑے بڑے سپیکر جن پر "المصطفی وڈھل ساؤنڈ سروس" لکھا تھا دور سے نظر آنے لگے. قریب پہنچا تو عجیب نظارا دیکھا لاکھوں کی تعداد میں پاکستانی بڑی بڑی داڑھیوں والے مولوی اور صوفی ایک سٹیج کے سامنے براجمان ہیں اور سٹیج پر دیدار اور نرگس کا مجرا چل رہا ہے۔

اپنی سزائیں بھول کر میں نے فرشتوں سے پوچھا" بھائی یہ قسم کی سزا ہے کیا یہ مجھے نہیں مل سکتی..؟"

"یہ سزا نہیں۔۔۔اِن سب کا بریک ٹائم ہے"۔۔۔فرشتے کا جواب سن کر میری جان میں جان آئی کہ مجھے بھی بریک ٹائم تو ملا کرے گا۔

اچانک ایک خیال کوندا۔۔۔" بھائی یہ سارے پاکستانی ہی ہیں جہنم میں یا کوئی اور قومیت بھی ہے..؟"

"باقی قومیں اپنی اپنی سزائیں صاف اور شفاف نیت سے کاٹ رہی ہیں یہ پاکستانی ہی ہیں جو بریک ٹائم میں احتجاج یا گانے سننے میں ضائع کر دیتے ہیں"۔۔۔پہلے فرشتے نے اپنے حساب سے میری معلومات میں اضافہ کیا۔لیکن پاکستانیوں کی یہ خاصیت مجھے پہلے سے پتا تھی۔

"باقی قومیں بریک ٹائم میں کیا کرتی ہیں۔۔۔؟ میں نے پوچھا۔

چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

"وہ قومیں یا تو پڑھتی ہیں یا پھر مختلف تعمیری کام کرتی ہیں۔ یہ سپیکر ساؤنڈ سسٹم، بینرز، لکھائی وغیرہ باقی قوموں کی ایجادات ہیں" دوسرے فرشتے نے اضافہ کیا۔

تھوڑا آگے چلے ایک طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔۔۔

"اوئے نواز، اوئے شہباز، اوئے زرداری، اوئے فرشتو" میں سمجھ گیا کہ خان صاحب کا دھرنا عروج پر ہے اس لئے فرشتوں نے ادھر جانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن میرا دل "صنف نازک" دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ شاید فرشتے نے میرے دل کی بات جان لی اور بولا۔۔۔ "یہاں دھرنے میں مستورات کا داخلہ منع ہے اس لئے یہ گندی سوچ دل سے نکال دو"

"تو پھر دھرنے میں آتا کون ہے"۔۔۔ میں نے تجسس سے پوچھا"۔

صرف خود خان صاحب" فرشتے نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

تھوڑا آگے بڑھے تو دیکھا ن لیگ کے تمام ارکان گفت وشنید میں مصروف تھے۔

"جہنم ہمارا گھر ہے ہم گھر کو سجانا چاہتے ہیں پورے جہنم میں "اورنج ٹرین"، "میٹرو بس"، "اوور ہیڈ برج" اور "دو رویہ سڑکیں" نہ بنی تو جہنم کا حسن برباد ہو جائے گا"۔۔۔ شہباز شریف کی گونجتی آواز سنائی دی۔

"لیکن اتنا بجٹ نہیں ہمارے پاس، کہیں تو کاسہ لے کر جائیں یورپین جہنمیوں کے دروازے پر"۔۔۔ اسحاق ڈار نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"جی جی بالکل! میں بھی کافی عرصے سے کوئی دوسرا جہنمی علاقہ نہیں گھوما دو فرشتے بک کروایئے گا"۔۔۔ نواز شریف نے اسحاق ڈار کو اجازت دیتے ہوئے کہا۔

فرشتے مجھے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھے تو ایک قافلہ آتا دکھائی

دیا، وہ ایک مانوس سا نعرہ لگا رہے تھے " کل بھی بھٹو زندہ تھا، آج بھی بھٹو زندہ ہے"۔

مجھے بھٹو کو دیکھنے کا بچپن سے ہی بڑا شوق تھا لیکن جب تھوڑا بڑا ہوا تو کسی کم بخت نے مجھے بتایا کہ بھٹو مر چکا ہے یہ تو پارٹی کو زندہ رکھنے کا نعرہ ہے۔ بھٹو کے نام پر لوٹنا اس پارٹی کے منشور میں شامل ہے۔ قافلہ بالکل قریب پہنچا تو میں نے متجسس لہجے میں "صدیوں کے بیٹے" جناب قائم علی شاہ سے پوچھ لیا" محترم شاہ صاحب۔۔۔ بھٹو کہاں پہ ہیں؟ کیا میں ان کے ساتھ ایک عدد "سیلفی" کھنچوا سکتا ہوں؟؟"

شاہ صاحب مردہ سی آواز میں بولے۔۔۔ "سائیں وہ تو جنت میں ہیں باقی ساری پارٹی جہنم میں ہے"۔

میں ان کا جواب سن کر دلبرداشتہ ہو کر فرشتوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا آگے گئے تو علی عظمت اور طاہر شاہ کی آواز لوگوں کی سماعت میں انڈیلی جا رہی تھی۔ مجھے سمجھ آگئی کہ بریک ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ فرشتوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں گھسا دیں۔ میں نے بھی اخلاقاً ان کو فالو کیا۔ تھوڑا آگے گئے تو ایک جگہ عوام کا جم غفیر نظر آیا۔ وہاں ایک بڑی سی الطاف بھائی کی تصویر نظر آئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جہنم میں بھی بھائی کے اتنے کارکن ہیں تو اس کا مطلب ہے بھائی یہاں بھی طاقت ور ہیں۔

میں نے تجسس کے مارے پوچھا۔۔۔ "بھائی، بریک ٹائم تو ختم ہو چکا ہے تو یہ جلسہ کیوں۔؟"

"یہ جلسہ نہیں بلکہ یہ بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ سامنے بیٹھے ہوئے لوگ ایک گھنٹے کی سزا کے طور پر بھائی کو سن رہے ہیں"۔

"اچھا تو بھائی خود جنت میں ہیں کیا۔۔۔؟" میرا تجسس ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔

"بھائی مرنے کے بعد بھی مرنے سے ڈرتے ہیں اس لئے اپنی کوٹھری میں سزائیں کاٹتے رہتے ہیں اور یہ تقریر ریکارڈ شدہ ہے"۔۔۔ فرشتوں نے مجھے آگے ہانکتے ہوئے بتایا۔

آگے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فٹ بال جیسا گول مٹول شخص نہایت مسکین صورت بنا کر بیٹھا ہے (مجھے طاہر اشرفی جیسا لگا)

رمضان کے مہینے میں مرزا غالبؔ، نواب حسین مرزا کے ہاں ملاقات کیلئے تشریف لے گئے۔ اور پان منگوا کر کھایا

ایک متقی اور پرہیزگار قسم کے مولانا صاحب جو پاس ہی تشریف فرما تھے، بڑے متعجب ہوئے اور پوچھا:۔ "حضرت آپ روزہ نہیں رکھتے"

مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا:۔ "شیطان غالب ہے۔

میں نے فرشتوں کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

"یہ سزا کے آخری مراحل میں ہے اس کی سزا تھی کہ اسے پانچ سال بچھوؤں اور سانپوں کے ساتھ رہنا ہے۔ یہ تمام سانپ اور بچھو کھا گیا ہے اب بیچارہ تیسرا سال ہے ایسے ہی گم سم سزا کے سال پورے کر رہا ہے"۔۔۔ فرشتے نے مجھے بتایا۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے بوریت ہونے لگی۔ میں نے جو کچھ پیچھے دیکھا تھا یہ سب میرا دیکھا بھالا تھا اور میں کچھ نیا دیکھنا چاہ رہا تھا۔ شاید فرشتوں کو بھی اس بوریت کا احساس ہوا اور انہوں نے مجھے آنکھیں بند کرنے کا کہا، میں نے حکم پر عمل کیا۔ چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں ہر جا نمستورات ہی مستورات، میرا دل بلیوں، کتوں، گھوڑوں اچھلنے لگا لیکن فوراً ہی میرے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ سوائے چند کے تمام عورتیں برقعے میں ملبوس خراماں خراماں گھومے جا رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ انداز میں فرشتے کی طرف دیکھا تو اس نے بتایا۔۔۔ "ایک دن غلطی سے ہم مولانا عبدالعزیز کو عورت سمجھ کر لے آئے جیسے ہی غلطی کا احساس ہوا اس وقت تک وہ تمام عورتوں کو برقعہ اوڑھا چکے تھے اور اب مولانا عبدالعزیز کو سزا کے طور "ہیجڑا" سیکشن میں جمع کروا دیا گیا ہے"۔۔۔ فرشتے نے تفصیلاً عرض کیا۔۔۔ اور جو برقعے کے بغیر تھیں ان کے بارے میں علم ہوا کہ وہ عاصمہ جہانگیر کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔

میری مسکین صورت دیکھ کر فرشتوں کو ترس ضرور آیا ہو گا لیکن انہوں نے اظہار نہیں کیا۔ تھوڑا آگے گئے تو فرشتوں نے میری

معلومات میں اضافہ کیا کہ تمہیں پہلی سزا ان عورتوں کے ہاتھوں ملے گی جن کے ساتھ تم نے فلرٹ کیا۔

میں ہکا بکا رہ گیا کہ ساری کی ساری جہنم میں کیسے آ گئیں۔

خیر مجھے ایک چارپائی قسم کے پھٹے پر الٹا لٹا دیا گیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ سو ڈیڑھ سو عورتوں کی ایک لمبی لائن ہاتھ میں ہنٹر ٹائپ کوڑے پکڑ کر آ رہی ہیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور فرشتوں کو پکارا "بھائی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ ساری میری نہیں ہیں. دھاندلی نہ کریں اور حق حلال کی سزا دیں۔

" بیٹے یہ ساری تمہاری ہیں لیکن ان میں سے اکثر نے تمہیں فیس بک پر اپنی اصلی تصویریں نہیں دی تھیں، اِس لئے تم پریشان ہو"

خیر ناچار پھر لیٹنا پڑا، پہلا کوڑا پڑا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ صرف فلرٹ ہی کیا تھا شادی نہیں کی۔ درد تو بہت ہوا لیکن عزت نفس کا سوال تھا پی پچا گیا۔ کوڑے پڑتے رہے میں برداشت کرتا رہا۔ اچانک ایک مانوس سا چہرہ نظر آیا میں حیران سا رہ گیا کہ وہ میری دنیاوی بیوی تھی۔

میں اٹھ بیٹھا اور بیوی سے مخاطب ہوا۔۔۔"بیگم خدا کو خوف کرو تم تو میری بیوی ہو تمہارے ساتھ میں نے کب فلرٹ کر لیا ہے"

بیگم کی آواز آئی۔۔۔"رات کو آپ کا انبوکس دیکھنے کے بعد میرا اتنا تو فرض بنتا ہے ناں"

اور محترمہ نے میری رضائی کھینچ کر بلے سے ایک زوردار شاٹ لگا کر مجھے یاد دلایا کہ جہنم جہنم ہوتی ہے، چاہے دنیاوی ہو یا اخروی۔

حفیظ جالندھری صاحب نے فانی سے کہا کہ آپ بھی بچوں کے لیے لکھا کریں کیوں کہ جو شاعری آپ کرتے ہیں اس کی زیادہ سے زیادہ قدر یہی ہوگی کہ لوگ آپ کا دیوان خرید کر لائبریری میں رکھ لیں گے۔ اس پر فانی بدایونی نے متانت کے ساتھ جواب دیا "جی ہاں! میری شاعری کا مجموعہ لائبریری میں ہوگا اور آپکا کلام بچے پڑھیں گے۔

ذہین احمق آبادی

الفاظ کی جگالی

چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم
(قلم کی جگہ حمق بھی لگا سکتے ہیں...!)

آپ سوچ رہے ہونگے کہ اپنا نام ''ذہین احمق آبادی'' رکھ کر میں نے نامعقولیت پھیلانے کا سامان کیا ہے۔۔۔لیکن یقین مانیے کہ میں ایک ''معقول احمق'' ہوں۔۔۔اب آپ سوچ رہے ہونگے کہ احمق بھی کبھی معقول ہوا ہے۔۔۔!مگر میں پھر بھی اسی پر اصرار کروں گا کہ میں ایک معقول احمق ہوں۔۔۔آخر احمق ہی ٹھہرا۔۔۔کسی کو اعتراض ہو تو روک دے۔۔۔!ویسے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ دنیا میں عقلمند گردانے جانے والے لوگ ہی نامعقول احمق ہیں۔۔۔جنہوں نے پوری دنیا کو حماقت کے جال میں پھانس رکھا ہے۔۔۔اور وہ ہیں۔۔۔سائنسدان۔۔۔جی ہاں۔۔۔کہہ دیجئے کہ میں لغویت کا پجاری ہوں۔۔۔جو برا مانوں تو پانچ روپے آپ کے۔۔۔اگر کوئی احمق کسی بات کا برا مان جائے تو سمجھ جائیں کہ اس کا حمق بنڈل ہے۔۔۔تو میں کہہ رہا تھا کہ سائنسدان سب سے بڑے احمق ہیں۔۔۔ترقی کا جھانسا دے کر چلے ہیں ہائیڈروجن اور ایٹم بم بنانے۔۔۔واہ واہ۔۔۔سبحان اللہ۔۔۔چشمِ بد دور۔۔۔بے اختیار گردن چومنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔چاقو سے۔۔۔۔غالباً ناپنا کہنا چاہئے تھا۔۔۔احمق سمجھ کر معاف کر دیجیے۔۔۔ویسے آپ کے کون سے پیسے لگ رہے ہیں۔۔۔لگ بھی رہے ہوں تو میری بلا سے۔۔۔دھت تیرے کی۔۔۔! میں دنیا کے چند بڑے احمقوں میں سے ہوں۔۔۔ اور مجھے اس پر فخر ہے (ہے نا کتنی بڑی حماقت۔۔۔!)۔۔۔آپ کے خیال کے مطابق اگر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے تو میں احمق نہیں ہو سکتا۔۔۔لیکن میرا دعوی ہے کہ اس سے میرا حمق نہ صرف مستزاد ہو جاتا ہے بلکہ پہلو بہ پہلو استناد کا متحمل بھی ہو جاتا ہے۔۔۔اور یہ احساس ہی مجھ سے حماقت کا ارتکاب کراتا ہے کہ اگر میں احمق ہوں تو ذہانت کا احتمال کیونکر کر سکتا ہوں۔۔۔ ویسے احمق ہوتے ہوئے ذہانت کا ارتکاب بذاتِ خود حماقت ہے۔۔۔ ہائیں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔عقلمندوں کی سی باتیں شروع کر دیں۔۔۔ ہوگئی نا حماقت۔۔۔فلسفہ بھونکنا شروع کر دیا۔۔۔کبھی کبھی عظیم حماقتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے عقلمند تصور کر لیں۔۔۔میں. گالی بالکل بھی برداشت نہیں کرتا۔۔۔ ہاں۔۔۔! عورتیں بھی احمقوں پر جان چھڑکتی ہیں... بشرطیکہ وہ انکے شوہر 'کامدار' نہ ہوں۔۔۔جن کی طبیعت ہمیشہ صاف کی جاتی رہتی ہے۔۔۔

جھاڑو سے۔۔۔! ویسے عورتوں کا مشغلہ چغد پیدا کرنا ہے جو کہ احمق سے بھی آگے کی چیز ہوتی ہے۔۔۔ جیسا کہ دلاور فگار فرما گئے۔۔۔

بھولتی جاتی ہے دنیا اب یہ قولِ مستند
عقل چوں پختہ شود انسان احمق می شود
فطرتاً احمق جو ہو انساں نہیں ہوتا وہ بد
اِس سے اعلیٰ نسل کے احمق کو کہتے ہیں چغد

اس کا نسخہ یہ ہے کہ ایک ذہین مرد (میرے جیسے) سے شادی کی جائے اور بس۔۔۔ اس سے آگے کچھ تگ و دو کی ضرورت ہی نہیں۔۔۔ وہ شخص کچھ عرصے میں ہی اپنے آپ کو چغد محسوس کرنا شروع کردے گا۔۔۔ اور اپنا بیان یاد کر کے۔۔۔ "بقائم ہوش و حواس۔۔۔ تمام تر بونگیوں سمیت۔۔۔ میں اسکو اپنے حرم میں شامل کرتا ہوں۔۔۔ "یعنی 'قبول ہے' کے داغے گئے تین فائر یاد کر کے اس کی صدائیں گونجا کریں گی۔۔۔ شادی کر دریا میں ڈال۔۔۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو شادی سے قبل یہ ہانکتے پائے گئے ہیں۔۔۔ بقول ابنِ صفی

اُف یہ ترا تیرِ نظر، زخمی جگر، جاؤں کدھر
ہے آج 'سنڈے' جانِ من، چھٹی پہ ہیں سب ڈاکٹر

بات گو انتہائی درجہ بے سروپا اور لغو ہے۔۔۔ اور ہونی بھی چاہئے۔۔۔ احمق کی بات ایسی نہ ہوگی تو اور کس کی ہوگی۔۔۔! ذہین اور احمق میں یہی فرق ہے کہ ذہین شادی کہ بعد چغد اور احمق، احمق ہی رہتا ہے۔۔۔ ذہین کی 'چغدیت' کا ثبوت یہ ہے کہ وہ پہلی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی بھی اکثر کرتا ہے اور وہ بھی ایسی عورت سے جو گزشتہ بیوی سے کم خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔ لوگ آوازے کستے ہیں مگر اسے اس وقت تک پتا چل چکا ہوتا ہے کہ خوبصورتی کدھر اور کس کس طرح کاٹتی ہے۔۔۔ کیونکہ مرد صورت پرست ہوتا ہے جبکہ شوہر سیرت پرست۔۔۔ کچھ عورتیں صبح شوہر کو 'چھوڑنے' سے قبل اچھی طرح دم کرتی ہیں کہ ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔۔۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ دم ہوتا ہے ناک میں جو بعد ازاں دوسری شادی پر منتج ہوتا ہے... مرد ایک دوسرے کی توہین کرتے رہتے ہیں لیکن انکا مقصد توہین نہیں ہوتا۔۔۔ عورتیں ایک دوسرے کی تعریف کرتی رہتی ہیں، انکا مقصد بھی تعریف نہیں ہوتا۔۔۔ خواتین عموماً پابندی پسند نہیں کرتیں چاہے وہ سیٹ بیلٹ کی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ وہ جرمانے سے بچنے کیلئے اسے کندھے سے گزار کر گود میں رکھ لیتی ہیں۔۔۔ یا پھر ہاتھ میں پکڑے رکھتی ہیں... غالباً یہ کوئی نفسیاتی سرشت ہے۔۔۔ مگر جب کوئی حادثہ ہوتا ہے تو پھر وہ یا تو گاڑی کو رفتار میں شکست دے کر شیشے سے باہر پڑی ہوتی ہیں یا ماتھا پھوڑ لیتی ہیں۔۔۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی سیٹ بیلٹ بذاتِ خود مضبوط ہوتے ہوئے بھی انکو نہیں بچا سکتی... ہم مسلمانوں نے بھی کلمے کو قلب میں اٹکانے کے بجائے فتووں سے بچنے کیلئے بس گلے میں پھنسا رکھا ہے۔۔۔ وقتی کام تو چل جاتے ہیں۔۔۔ نکاح، جنازے وغیرہ تو بھگت جاتے ہیں۔۔۔ مگر امتحان کا ایک جھٹکا ہمیں اسلام سے باہر پھینک دیتا ہے کیونکہ عروۃ الوثقیٰ ہمارے قلب میں نہیں بلکہ گلے میں اٹکا ہوتا ہے۔۔۔! خیر۔۔۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ احمق کی شادی بھی اسی وقت نمو پذیر ہوتی ہے جب عورت اس کی حماقت کو لیاقت سمجھ لے۔۔۔ مگر بعد میں کفِ افسوس ملتی رہ جاتی ہے کہ کیا حماقت ہوئی۔۔۔ اب انھیں کون بتائے کہ حماقت چھوت اور متعدی ضرور ہے مگر مہلک نہیں۔۔۔ ہاں کبھی کبھی مہلک بھی ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ سائنسدان ہوتے ہیں۔۔۔ جو خلائی دوڑیں لگاتے پھرتے ہیں اور نیچے زمین والے دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ ارے ارے! پہلے دنیا کے مسائل تو سلجھا لو۔۔۔ پھر بھلے چاند کے مسائل بھی اپنے سر لیتے رہنا۔۔۔! چونکہ میں 'ماہرِ لڑکیات' نہیں ہوں کہ آپکو عورت کہ موضوع پر بے تکان بور کر کے جھک مارتا رہوں... تو میں نے سوچا ہے کہ 'طلسمِ ہوشربا' لکھ ڈالوں۔۔۔ کیا خیال ہے۔۔۔! اور دور چونکہ ترقی کر چکا ہے اس لیے حال سے

ہی مطابقت پیدا کرنی پڑے گی۔۔۔ بادشاہت کی جگہ جمہوریت اور اسکے عہدے بیان کرنے پڑینگے۔۔۔! ایک اقتباس سے اپنی عقل کو شکم سیر کرنے کی کوشش کیجیے…!

"راوی بیان کرتا ہے کہ صدر کا نسب چونکہ عمرو عیار سے ملتا تھا، اسی لیے اس کی گلیم اسے وراثت میں پہونچی۔۔۔ اسی وجہ سے لوگ اس کے صورت آشنا نہیں تھے۔۔۔ راوی ماجرا بیان کرتا ہے کہ جن ایام وہ اس منصب تک پہونچا تو سردیوں کا موسم بجوبن تھا جو گلیم اتانے میں مانع تھا۔۔۔ واللہ اعلم۔۔۔ ان ایام میں جو وہاں کا وزیرِ اعظم تھا وہ ایک 'دراز' قد شخص تھا۔۔۔ وہی وہی جی ہاں۔۔۔ جو الماری کے ساتھ ہوتی ہے۔۔۔ نہ صرف طول اور عرض کی حامل ہوتی ہے بلکہ شکم بھی رکھتی ہے۔۔۔ تو یہاں سے اس وزیر کا حال بتاتمل سنو کہ اسکی عقل ایک 'دیو' نے ایک دراز میں بند کر رکھی تھی۔۔۔ جو بعد ازاں تحقیق و توثیق سے بینک کی ثابت ہوئی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔! اس وزیر کو "دورے" پڑتے رہتے تھے، وہ بھی غیر مقامی۔۔۔ راوی مزید گوش گزار کرتا ہے کہ وزیر کے اسی کھلواڑ کے باعث کچھ لوگوں نے اس کے کاخ و ایواں کے در و دیوار ہلانے کیلیۓ انکے سامنے میلہ لگالیا۔۔۔ اور مدعی ہوئے کہ ہم نے کشتیاں جلادی ہیں۔۔۔ بعدہٗ وزیر نے اس بابت انھیں قاصد رسید کیا جو کہ 'عالمِ رویا' میں ان تک طارق بن زیاد کا پیغام لیکر نمودار ہوا۔۔۔ "کاکے! کشتیاں جلانے اور بچیاں نچانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔۔۔!" مگر طرفین کے کانوں کی جوئیں تک لمبی تان کر "میٹھا پان" نوشِ جان کر کے "خوابِ جوں" کے مزے لے رہی تھیں۔۔۔!"

سچ بولوں تو میرے کان پر جب بھی جوں رینگتی ہے میں اس کو مار دیتا؟ ہوں۔۔۔ برداشت نہیں ہوتی ناں۔۔۔! حالانکہ اسے تھپک تھپک کر سلا دینا چاہیۓ۔۔۔ بیچاری کی اچھی بھلی نیند خراب ہوجاتی ہے ہماری حرکتوں سے اور اسے رینگنا پڑتا ہے۔۔۔ دھت تیرے کی… یہ کیا شروع کردیا میں نے۔۔۔ کچھ خیال نہ کیجیے گا۔۔۔ بس کھسک جاتا ہوں، احمق ہی ٹھہرا۔۔!

الحمدللہ!!

بیادِ مرزا غالبؔ

غالبؔ شیوہ بیاں تھے محسنِ اردو زباں
ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں جن کی عظمت کے نشاں

متفق اس بات پر ہے آج ہر غالبؔ شناس
اُن کی اردو شاعری ہے ایک نقشِ جاوداں

اُن کے مکتوبات ہیں اردو ادب کے شاہکار
اُن کے رشحاتِ قلم ہیں ایک گنجِ شایگاں

شخصیت غالبؔ کی اپنے عہد میں تھی تابناک
اُن کے افکارِ درخشاں آج بھی ہیں ضوفشاں

مرزا غالبؔ جو تھے اقلیمِ سخن کے تاجدار
آج بھی ملکِ سخن میں اُن کا سکّہ ہے رواں

تھے وہ اپنے عہد میں سود و زیاں سے بے نیاز
آج ہیں افکار اُن کے مرجعِ دانشوراں

مرزا غالبؔ کی ہے عصری معنویت برقرار
مِٹ نہیں سکتے کبھی اُن کے نقوشِ جاوداں

جملہ اقصائے جہاں میں آج غالبؔ کی ہے دھوم
ہر جگہ اقوامِ عالم میں ہیں اُن کے قدرداں

کیف و سرمستی تغزل اور حُسنِ فکر و فن
برملا اشعار سے غالبؔ کے برقیؔ ہیں عیاں

احمد علی برقیؔ اعظمی

شوکت علی مظفرؔ

میک اپ شیک اپ

میک اَپ کا سنتے ہی لڑکیاں اور پھر بیوٹی پارلر کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ مَلک نے سوال پوچھا ''لڑکیاں خود میک اَپ کا سنیں تو پھران کے ذہن میں کیا تصور آتا ہے؟'' ہمارا جواب تھا جو ابتدا میں بیان کردیا، کیونکہ لڑکی کبھی بھی اپنے میک اَپ سے مطمئن نہیں ہوتی اسے ہمیشہ دوسری لڑکیوں کا ہی خیال آتا ہے کہ وہ منحوس سلمٰی فلاں پارٹی میں مجھ سے زیادہ اسمارٹ اور پرکشش لگ رہی تھی۔ مُلک میں جب سے ساس بہو کے ڈراموں کا چلن عام ہوا تب سے عورتوں میں بھی فیشن کی وبا عام ہوگئی اور بیوٹی پارلر دھڑا دھڑ یوں کھلنے لگے جیسے بارش کے بعد گٹر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ آدھی لڑکیاں بیوٹیشن ہیں اور آدھی ابھی تربیت حاصل کررہی ہیں جسے یہ سہولت میسر نہیں وہ گھر پر دھاگہ ڈوری، قینچی لے کر ماہر بننے کی پریکٹس جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مختلف مواقع کے لیے مختلف میک اَپ کیے جاتے ہیں، پارٹی کا الگ، فیشن شو کا الگ، شادی بیاہ کا الگ اور میت کا الگ۔ ہماری تحقیق کے مطابق سب سے مشکل میک اَپ سادگی کا میک اَپ ہے کیونکہ سادگی تب ہی پرکشش نظر آتی ہے جب چہرے پر منحوسیت کے سائے نظر نہ آئیں لہٰذا یہ میک اَپ کرنا ہر بیوٹیشن کا کام نہیں۔

عمر شریف کو ہم نے شروع سے ہی عورتوں کے میک اَپ کے خلاف ہی باتیں کرتے سنا ہے۔ جب تک ہم خود میڈیا میں نہیں آئے تھے تب تک عمر شریف پر غصہ بھی آتا کہ خوامخواہ ہی بے چاری عورتوں کی برائیاں کرنے میں لگے رہتے ہیں لیکن ہمیں چار پانچ سالوں میں ہی پتہ چل گیا کہ جن عورتوں کی بات عمر شریف کرتے رہے وہ حق سچ ہیں کہ ایسی عورتیں چہرہ دھولیں تو آدمی کا گھٹنا خوبصورت نظر آنے لگتا ہے۔ بارہا ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا کہ جو پری چہرہ ہمیں کچھ بہتر لگتا وہ کچھ عرصے بعد اصلی حالت میں نظر آتا تو ہم خدا کا

لاکھ شکر ادا کرتے کہ رب نے ہمیں اتنا حسین بنایا ہے۔

ہم ایک چینل پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ایک دوست نے بتایا، آج نئے ڈرائیور کو جھاڑ پڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک سینئر نیوز کاسٹر کو پک کرنے ان کے گھر گیا تو ایک عورت نے گھر سے نکل کر اسے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا، جواب میں ڈرائیور بولا ”خالہ! میڈم کو بولو جلدی تیار ہو جائے، پہلے ہی دیر ہو گیا ہے۔“

خالہ نے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا ”بدتمیز انسان... میں تمہیں خالہ نظر آتی ہوں، جسے تم لینے آئے ہو وہ میں خود ہوں۔“

ڈرائیور نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”یا اللہ معاف کر دینا! اس کو تو ہم ٹی وی پر دیکھ کر غلط غلط سوچا کرتا تھا۔“

ایسی ہی ایک خاتون اپنے گھر کے میلے کپڑوں میں صبح سویرے بغیر میک اپ کے ایک بیکری میں گئیں اور سالگرہ کے لیے کیک کا آرڈر دیا کہ میں شام کو آ کر لے جاؤں گی۔

شام کو محترمہ تیار ہو کر جب کیک لینے گئیں اور کیک طلب کیا تو دکان کا سیلز مین سوچتے ہوئے بولا: ”ہاں ہاں یاد آیا! آپ وہی کیک لینے آئی ہیں نا، جس کا آرڈر آج صبح آپ کی امی دے گئی تھیں۔“

آج ہم نے جس میک اپ کی بات کرنی ہے۔ وہ عورتوں سے متعلق نہیں مگر میک اپ کا ذکر آتے ہی چونکہ لڑکیوں کا تصور ذہن میں آتا ہے، اس لیے یہ تصور کہاں سے کہاں لے گیا۔ بہر حال ہماری عوام نے جب سے یہ خبر سنی ہے کہ سیاستدان میک اپ کرواتے ہیں تب سے وہ پریشان بھی ہیں اور حیرت زدہ بھی۔

عوام بے چاری کو کیا خبر کہ جو بھی ٹی وی پر آتا ہے اس کے لیے بلا رنگ ونسل کی تفریق کے میک اپ لازمی ہوتا ہے۔ سیاستدانوں نے بیانات بھی دینے ہوتے ہیں، چھ چھ پارٹی وی ٹاک شوز میں بھی حصہ لینا ہوتا ہے اور پھر بریکنگ نیوز کے چکر میں یہ لوگ، سڑکوں پر ہاتھ میں مائیک لے کر گھومنے والے ہوسٹ سے کبھی بھی ٹکرا سکتے ہیں۔ اس لیے سیاستدانوں کا ٹی وی کے علاوہ بھی میک میں رہنا مجبوری بن گیا ہے۔ اسی حوالے سے ایک شاعر بہت پہلے فرما گئے ہیں ”ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ۔“

سیاستدانوں کو میک اپ سے بہت فائدے ہوئے ہیں ایک تو لوگ انہیں اصلی چہرے میں پہچاننے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اپنے حلقے میں بھی سیاستدان بغیر میک اپ کے گھوم گھام کر واپس آ جاتے ہیں اور کوئی کچھ بھی نہیں کہتا بلکہ خود کش حملہ آور یا ٹارگٹ کلر بھی ان کے ٹی وی والے چہروں سے واقف ہیں اس لیے اکثر سیاستدان بے فکر ہو کر بعض علاقوں میں سائیکل پر راؤنڈ لگا کر آ جاتے ہیں کہ انہوں نے نہ بلٹ پروف جیکٹ پہنی ہوتی ہے نہ گن مین ساتھ ہوتے ہیں بس منہ اچھی طرح سے دھویا ہوا ہوتا ہے۔ نوید قمر نے تو اپنی مونچھوں کے لیے دو بندے رکھے ہوئے ہیں، ایک مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے دوسرا پانی شانی مار کر انہیں تازہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیخ رشید بھی اپنے ہیر اسٹائل اور ڈینٹ پینٹ کے لیے بندہ ساتھ رکھتے ہیں، دروغ بر گردن راوی جب ان پر حملہ ہوا تھا تو تین بندے مر گئے تھے ایک بچ گیا تھا جو بچ گیا یہ وہی بیوٹیشن ہوگا ورنہ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو آج شیخ صاحب حیات تو ہوتے مگر معلوم نہیں سامنے آتے بھی یا نہیں۔

خبر میں تو یہ بھی ہے کہ زیادہ تر سیاستدان بالوں کو کالا رنگ کروا کر جوان نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ بقول ملک مرد کی جوانی کا اندازہ اس کے کالے بالوں سے نہیں کالے کرتوتوں سے کیا جاتا ہے۔ میاں صاحب کے بارے میں ہم کیا لکھیں کہ ایم کیو ایم نے ان کے حسن کے تذکروں کو اپنے مخصوص انداز میں کچھ عرصہ پہلے ہی بیان کر چکی ہے۔ ہمارے صدر صاحب تو جب سے ایوان صدارت میں آئے ہیں ہر خطاب اور جلسے سے پہلے ایک ہی بات کہتے ہیں ”میک اپ کھچ!“ چودھری

شجاعت حسین سے ان کے بیوٹیشن نے مروتاً پوچھ لیا ”سر جی! بالوں میں کیا لگاؤں؟“ تو جھٹ سے جواب آیا ”مٹی پاؤ۔“ اسلم رئیسانی بڑے جی دار بندے ہیں، وہ میک اَپ سے پرہیز کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے ”منہ منہ ہی ہوتا ہے، میک اَپ والا ہو یا اپنا ہو۔“

جب ٹی وی بلیک اینڈ وائٹ تھا تب بھی سیاستدان میک اَپ کرنے کے عادی تھے، حوالہ دینے کے لیے ہمارے پاس ٹھیک تاریخ، اخبار کا درست نام یا کالم نگار کا اسم شریف یاد نہیں مگر کالم کا متن ذہن میں ہے کہ ایوب خان بھی اپنی مونچھوں کو گھنٹوں ٹھیک کیا کرتے تھے بلکہ جنرل ضیاء الحق تو کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر پینسل سے جعلی مونچھیں بنانے کے بعد پروگرام ریکارڈ کروایا کرتے تھے۔ جنرل مشرف کا دور ہم نے دیکھا ہے بلکہ کئی تقریریں اور قوم سے خطاب بھی براہِ راست ملاحظہ کیے ہیں جس میں وہ مکمل اکڑ کر بیٹھے نظر آتے رہے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ بغیر کلف کے اتنا اکڑ ہی نہیں سکتے۔ وردی میں کلف ہونہ ہو مگران کے چہرے پر کافی کچھ لگا کر انہیں سخت گیر حاکم دکھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہوگی۔ میک اَپ کے بل بوتے پر ہی تو وہ کہتے رہے ”میں ڈرتا ورتا کسی سے نہیں ہوں۔“ یہ تو میک اَپ اور وردی دونوں اترنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ اصل میں کیا تھے؟ ایسے ہی ایک جنرل نے جنگ کے دوران اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ سب لال رنگ کا لباس پہن لیں اور چہروں پر رنگ بھی لال کرلیں۔ جنگ ہوئی تو دشمن کی فوج گھبرا کر واپس بھاگنے لگی، سپاہی نے پوچھا ”جنرل صاحب! آپ نے کیا فارمولا پیش کیا، اس کی لو جک کیا تھا کی دشمن بھاگ رہا ہے۔“ جنرل صاحب نے اکڑتے ہوئے جواب ”دراصل، لال رنگ کا مطلب یہ ہے کہ دشمن دیکھ کر ہی سمجھ جائے، غصے سے ہمارے چہرے سرخ ہیں اور لال کپڑوں سے وہ ہمیں وحشی سمجھ کر ڈر جائے اور ایسا ہی ہوا۔“ اتنے میں ایک دوسرا سپاہی آیا اور جنرل صاحب کو اطلاع دی ”جنرل صاحب! دشمن تین گنا زیادہ کمک لے کر پیش قدمی کر رہا ہے۔“ جنرل صاحب نے گھبراتے ہوئے فوراً آرڈر کیا ”سب پیلے رنگ کی پینٹ پہن لیں اور چہرے بھی پیلے کرلیں۔“

ایک بات تو طے ہے کہ کالوں کی نسبت گوروں کو میک اَپ کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ ایک افریقی بچے نے نظم لکھی تھی ”کلرڈ“ اس کا ماخذ ہے کہ ”میں پیدا ہوا تو کالا تھا، بڑا ہوا تو کالا تھا، بیمار ہوا تو کالا تھا، مرا تو کالا تھا۔ مگر اے گورے، تم پیدا ہوئے تو گلابی تھے، بڑے ہوئے تو سفید ہوگئے، بیمار ہوئے تو پیلے پڑ گئے اور جب مرے تو نیلے ہوگئے اس کے باوجود تم مجھے کہتے ہو کہ میں کلرڈ ہوں۔“

ہمیں بھی تعصب میں پڑے بغیر دعا کرنی چاہئے کہ ہمیں وہ سیاستدان نصیب آجائیں جو اپنا چہرہ سجانے کی بجائے دھرتی کو سجائیں اور سنواریں مگر دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے سے پہلے قوم کو ”میک اَپ“ ضرور کر لینا چاہیے!!

گالیاں

آئے دن مرزا صاحب کو گمنام ناموں سے خطوط آتے جو فحش کلامی اور گالی گلوچ سے پُر ہوتے۔ مگر مرزا صاحب ان خطوط کو پڑھ کر برہم ہونے کی بجائے اس میں بھی مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ جیسا کہ آپ کو ایک خط آیا جس میں ماں کی گالی لکھی ہوئی تھی، مسکرا کر کہنے لگے کہ ”اس اُلو کو گالی دینی بھی نہیں آتی، بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟

مولانا حالی کی ”یادگارِ غالب“ سے ایک اقتباس

محمد عارف

ایک سنجیدہ مزاح گو

مزاح، پھر منظوم مزاح اور بالخصوص سنجیدہ منظوم مزاح بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نکتہ آرائی ایک خاص لائن پر ہی مزاح کا درجہ اختیار کرتی ہے اس سے نیچے سنجیدہ اور اوپر پھکڑ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اس لائن کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ آپ کی پانچ میں سے چار کتابیں طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہیں جب کہ پانچویں سنجیدہ شاعری کی کتاب ''نعمتیں کیا کیا'' شعبۂ طب سے متعلق ہے۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی مزاحیہ شاعری کی معروف اصناف قطعہ، غزل اور نظم کی صورت میں معیاری مزاح تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کی مزاحیہ شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصّے میں بطور سپیشلسٹ ان کی تین تخلیقات ''ہوئے ڈاکٹری میں رُسوا'' ''دوا بیچتے ہیں'' اور ''ہسپتالی شاعری'' کا بڑا حصّہ ان کے اپنے پروفیشن سے متعلق ہے اس کے بارے میں انور مسعود نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اپنے تجربے کی بنا پر ڈاکٹر صاحب نے بہت سے رازوں سے پردے اُٹھائے ہیں اور ''وِچلی'' باتیں کی ہیں۔ ان کا مجموعہ طب و شعر و ظرافت کا خوب صورت مرقّع ہے۔'' اس حصّے کی شاعری مریض ڈاکٹر اور ہسپتال کی تثلیث میں مقیّد ہے۔ دوسرے حصّے میں انہوں نے بطور جنرل فزیشن معاشرتی بیماریوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔

تجربے، مطالعے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری کو جس فنی چابک دستی اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تاہم اکثر مقامات پر ان کا مزاح طنز کے زیر اثر تو دکھائی دیتا ہے، لیکن کہیں پر فکری و فنی جھول نظر نہیں آتا اور مجموعی طور پر قاری تبسّم زیرِ لب کی کیفیت سے دوچار رہتا ہے۔ بہ قول سرفراز شاہد: ''ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اپنے متبسّم اشعار سے ڈپریشن زدہ لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں، ان کے ہاں شگفتگی، سادگی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے اور یہی عمدہ مزاحیہ شاعری کی پہچان ہے۔''

ہے لرزہ براندام زمیں قصرِ غزل کی
شاعر ہے کہ اوزان ہے ہانپ رہا ہے
حیران و پریشاں ہیں ردیف اور قوافی
کس شعر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

وسوسے اُٹھتے ہیں دل میں اس قدر
ہول آتا ہے مجھے یہ سوچ کر
ہوں جگر کے عارضے میں مبتلا
کیسے بیٹے کو کہوں لختِ جگر

سی لیول، شی لیول

ایک مرتبہ ریڈیو انجینئروں نے خواہش ظاہر کی کہ پروگرام پروڈیوسروں کو ریڈیو انجینئرنگ کی مبادیات سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ کریں تاکہ یکسر بے خبری اور لاعلمی کی کیفیت ختم ہو، چنانچہ نئے ریڈیو اسٹیشن (اب تو نیا ریڈیو اسٹیشن بھی خاصا پرانا ہو چکا ہے) کے ہال میں تمام پروگرام اسٹاف کو جمع کیا گیا اور چیف انجینئر نے لیکچر دینا شروع کیا۔

لیکچر کے دوران میں بار بار سی لیول sea level کا ذکر آتا تھا، یعنی یہ بتانا مقصود تھا کہ سمندر کی سطح سے بلندی کا ہوا کی لہروں سے کتنا تعلق ہے۔

جب نہایت کثرت کے ساتھ سی لیول Sea Level کا ذکر ہوا تو پی این او Presentation Organizer عبدالباسط نے میرے کان میں کہا۔۔۔ ''اسے تو سی لیول Sea Level کے ذکر ہی سے فرصت نہیں اور ہم پروگرام والے لوگ شی لیول She Level سے آگے کچھ سوچتے ہی نہیں۔''

یہ لاہور ہے از ابوالحسن نغمی

نت نئی یارو بنی ہیں اصطلاحیں آج کل
ان کو کیا کہیے بھلا کیسے معانی دیجیے
پوچھا جب میں نے تواضع کے لیے، کہنے لگے
چائے رہنے دیجیے کچھ چائے پانی دیجیے

اپنے پیشے اور شوق سے اُن کی وابستگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہسپتال اور ہسپتال کے پچاس سے زائد شعبہ جات اور سیکڑوں بیماریوں کو صورت طنز و ظرافت پیش کیا ہے۔ جس کی مثال کسی اور مزاحیہ شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ ان موضوعات پر اُن کی قادر الکلامی ملاحظہ ہو:

الٹراساؤنڈ

آواز کی لہروں سے تصویر کا بن جانا
کرتی ہیں ہمیں ششدر تشخیص کی یہ چیزیں
''ڈسکو'' کو اگر دیکھیں ہم الٹراسونک سے
اُبھریں گے ڈریکولا تصویر کے پردے میں

ڈسپنسر

اس کے نسخے کم نہیں اسپیشلسٹوں سے حضور
جانیے مت اس کو ہرگز عام سادہ ڈاکٹر
اینٹی بائیوٹک، ڈرپ ہر چیز وہ بے خوف دے
میرا ڈسپنسر تو ہے مجھ سے زیادہ ڈاکٹر

نظم ''شیر خواری'' کا ایک بند دیکھیے:

ڈبے کا دودھ آپ نے ایجاد کر دیا
اب شیر خوار ماں کے بنا پال دیجیے
ہر چیز ناپ تول کے ڈالی ہے آپ نے
ممتا بھی تھوڑی اس میں ذرا ڈال دیجیے

اس کے علاوہ ''ویگن''، ''بجٹ کے بعد''، ''موٹر سائیکل''، ''غضب کا تھا'' بہترین نظمیں ہیں اور ''بیوٹی پارلر میں''، ''سو ہے وہ بھی ڈاکٹر''، ''اس ہاتھ لے اس ہاتھ لے''، ''اے مرے بچے اے مرے لختِ جگر پیدا نہ ہو''، ''کوئی شام گھر بھی رہا کرو'' تضمین و تحریف کی عمدہ مثالیں ہیں۔

چار مصرعوں کا قطعہ آج کی مزاحیہ شاعری کا ایسا ہتھیار ہے جس سے ہر اچھا شاعر مسلح ہوتا ہے انور مسعود نے اسے ایک سانس کی صنفِ سخن قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھا مزاحیہ قطعہ ''گرنیڈ'' کی صورت ہوتا ہے جو پل میں مشاعرے کا پانسہ پلٹ کے رکھ دیتا ہے۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کے ہاں جا بجا ایسے خوب صورت قطعات ملتے ہیں۔

جو کمایا تھا وہ سب اُٹھ گیا بیماری پر
جب کلینک سے میں نکلا تھی داماں نکلا
ایک انبار دواؤں کا ہزاروں نسخے
"بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا"

دیکھیے تو یہ کاروبارِ ہوس
بس کی اک سیٹ پہ ہیں بیٹھے دس
چشم و لب بھی ہلا نہیں سکتے
بس میں بیٹھے ہیں اور ہیں بے بس

مزاحیہ اصناف سخن میں سب سے مشکل صنف سخن غزل ہے اس کی وجہ ریزہ خیالی کی بدولت ہر شعر کے لیے الگ سے مزاحیہ مضمون کی ضرورت ہے، وہی مضمون یا خیال جس پر ایک پوری مزاحیہ نظم تعمیر کی جا سکتی ہے غزل میں دو مصرعوں تک محدود ہو کے رہ جاتا ہے۔ مزاحیہ غزل میں بھی اشعار کو عام سطح سے اٹھانے کے لیے بھرپور محنت اور استادانہ مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس صنف کے ساتھ بھی موصوف مکمل انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کی بعض نظمیں قافیہ وردیف یا خیال کی بدولت مسلسل غزلیں ہیں جن کو انھوں نے یہ عنوان پیش کیا ہے۔ غزلیات سے انتخاب دیکھیے:

پابرہنہ ہی آنا مسجد میں
ورنہ ہوگی دھیان میں گڑبڑ

ہے بعد عشق شادی کی بالکل یہی مثال
اٹکا کھجور میں جو گرا آسمان سے

ہیں مداری یہاں پہ سب لیڈر
ان پہ دارومدار کون کرے

شور کر کے اسے کیا "ڈس مس"
ہو گیا وہ بحال چپکے سے
جسے کہتا تھا میں غصے میں سالا
وہی اب میرا سالا ہو گیا ہے

جس کو تضمین یہاں کہتے ہیں سارے شاعر
درحقیقت ہے وہی مصرع تَر کی چوری

مزاحیہ شاعری کے جدید ترین دور سے تعلق رکھنے والے اس مزاح گو کی طنز یہ و مزاحیہ شاعری میں نت نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ تضمین، تحریف، موازنہ، تضاد، رعایت لفظی، مبالغہ، صورت واقعہ وغیرہ کے کامیاب نمونے ملتے ہیں لہٰذا فکر وفن کی اسی رنگارنگی کی بناء پر ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کو میڈیکل ڈاکٹر کے بجائے پی ایچ۔ ڈی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

گورنمنٹ کا فائد

ایک مرتبہ ایک گلوکار ہمارے ہی ریڈیو اسٹیشن سے ایک راگ گا رہا تھا کہ اتنے میں ڈیوٹی روم میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ریڈیو پاکستان لاہور" ۔۔۔ ڈیوٹی آفیسر نے فون اٹھا کر کہا۔

"صاحب دیکھیے اس وقت جو صاحب راگ گا رہے ہیں، اس میں صرف پانچ سُر لگتے ہیں، مگر یہ صاحب چھ سُر لگا رہے ہیں!"

"تو ایک سُر زیادہ لگا کر گورنمنٹ کا فائدہ ہی کر رہے ہیں" ۔۔۔ ڈیوٹی آفسر نے پوری متانت سے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔

یہ لاہور ہے از ابوالحسن نغمی

خادم حسین مجاہدؔ

چھیڑ غالب سے۔۔۔

مرزا اسد اللہ خان غالب 27 دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ بیسویں صدی میں پیدا ہوتے تو ان کی صلاحیتوں کی قدر زیادہ ہوتی۔ اب ظاہر ہے غالب اٹھارہویں صدی میں اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوئے، اگر دنیا میں بھیجنے سے قبل ان سے رائے لی جاتی تو شاید وہ بیسویں کے بجائے اکیسویں یا اس کے بھی بعد کی کسی صدی میں پیدا ہونے پر راضی ہوتے، بلکہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ پیدا ہونے سے ہی انکار کر دیتے۔ ہمارے خیال میں اچھا ہی ہوا کہ غالب اٹھارہویں صدی میں ہی پیدا ہو گئے ورنہ بیسویں صدی میں دوسرے باصلاحیت لوگوں کی طرح پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوتے اور نمبر دو شاعران سے زیادہ مقبول ہوتے۔ اس مہنگائی کے دور میں وہ دوسرے کئی اوریجنل شعراء کی طرح دیوان چھپوانے کا سوچ بھی نہ سکتے، بلکہ امراء اور آفیسرز کو غزلیں بیچ رہے ہوتے اور اب تک بند شاعروں کے خوبصورت دیوانوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھر رہے ہوتی، اور ناقدری کے اس دور میں شاعروں کی بھیڑ میں اپنی جگہ نہ بنا سکتے، اور شاعری کے علاوہ کوئی اور کام نہ کر سکنے کی وجہ سے بھوکوں مرتے۔

پھر کیا خبر وہ آج کی طرح شاعری میں سب سے زیادہ زرخیز زمینوں کے مالک ہونے کے بجائے دوسروں کی زمینوں میں کاشت کاری کر رہے ہوتے۔ 17 اکتوبر 1810ء میں غالب کو غنفوانِ شباب میں بصورتِ شادی دہلی میں عمر قید ہوئی۔ ان کی جیلر امراؤ بیگم قرار پائیں۔ وہ بھی آج کل کی بیشتر بیویوں کی طرح زیادہ سخن پسند نہ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ زمانے بھر سے داد وصول کرنے والا غالب گھر سے طعنے اور کوسنے ہی پاتا تھا، کیونکہ اس کے شعر دنیا میں آگ لگا سکتے تھے مگر گھر کا چولہا نہیں بھڑکا سکتے تھے۔ آم اور شراب مرزا کی کمزوری تھے۔ ان کے خیال میں ان

میں دو خصوصیات ہونا چاہئیں، ایک ''عمدہ'' اور دوسرے ''کثیر''۔ رات سونے سے قبل ضرور پیتے تھے۔ دن میں صرف اسی صورت شغل کرتے جب برسات ہوتی۔ ان کو جب والد کی پنشن ملتی یا کسی مہاجن سے قرض لیتے تو اس سے صرف شراب خرید لاتے چاہے گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ان کا کہنا تھا کہ کھانے کا ذمہ خدا نے لیا ہے پینے کا نہیں۔

مرزا بلا کے حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے۔ ایک باران کے پاس لکھنو سے کچھ لوگ آئے۔ دورانِ گفتگو ایک صاحب بولے ''مرزا صاحب دلی میں گدھے بہت ہیں''۔ مرزا متبسم ہوئے اور بولے ''کیا کریں حضور! باہر سے آجاتے ہیں۔'' ایک اور صاحب بولے ''فلاں شخص نے آپ کے خلاف کتاب لکھی، آپ نے جواب کیوں نہ دیا؟'' مرزا بولے ''گدھا دولتی جھاڑ دے تو کیا جواب ہوسکتا ہے؟'' ایک صاحب بولے ''مرزا آپ تو آموں کے رسیا ہیں حالانکہ آم تو گدھے بھی نہیں کھاتے''۔ مرزا بولے ''بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔'' دوسروں کے خط پڑھنا بری بات ہے مگر غالب کے خطوط پڑھنے کی اجازت عام ہے۔ انہوں نے القابات کی رسیوں میں جکڑے خطوط کو آزادی دلائی اور خطوط میں وہ شوخیاں ڈال دیں کہ اہلِ ذوق کسی حسینہ کے خطوط سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ ان کے خط پڑھتے ہیں۔ وزارتِ تعلیم نے ان کے خطوط کو داخلِ نصاب کر دیا کہ لو بچو پڑھو، تمہارا چچا اس طرح لفظوں سے اسکواش کھیلتا تھا۔ مرزا ڈاک والوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے اسی لیے ضروری خط ہمیشہ بیرنگ بھیجتے تھے اور دوستوں کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بیرنگ خط رجسٹری سے بھی زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ مرزا کے اس طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ محکمہ ڈاک اپنے اصولوں میں آج تک وضعداری نبھائے ہوئے ہے۔

مرزا آج زندہ ہوتے تو اس مستقل مزاجی پر محکمہ ڈاک کا قصیدہ ضرور کہتے۔ مرزا کسی کے خط کے آنے کو اس کے خود آنے سے کم نہیں سمجھتے تھے، اس لیے کسی دن اگر کوئی ان سے ملنے نہ آتا تو خود پہنچ جاتے بصورتِ خط۔ ان کے آخری دن خطوں کے سہارے ہی گزرے۔ ہر خط کا جواب نہایت پابندی سے دیتے۔ کبھی کبھار صورتِ حال یوں ہو جاتی قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں غالب مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے بھی منسلک رہے۔ جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے جہاں دربار سے متعلق اکثریت کو پھانسی دے دی وہاں غالب کو نہ صرف چھوڑ دیا بلکہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا، کیونکہ ایک تو وہ خود کو آدھا مسلمان کہتے تھے، دوسرے وہ براہِ راست ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے بادشاہ کو امورِ سلطنت سے ہٹا کر شاعری میں لگایا اور انگریزوں کا کام مزید آسان کیا۔ مرزا کی شاعری میں ہر رنگ ہے۔ کہیں وہ معرفت کی اس منزل پر ہوتے ہیں کہ بہشت کے دوزخ میں ڈالنے کی تجویز دیتے ہیں کہ لالچی ہاتھ ملتے رہ جائیں، اور کہیں محبوب سے شاکی ہیں کہ اس نے بیچ میں بیٹھے کی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ کہیں وہ واعظ کو چٹکیاں لیتے ہیں تو کہیں موت تک کو ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔

لیکن جب انہوں نے دیوان مرتب کیا تو اپنی رنگین جوانی کی سنگین شاعری کا بیشتر حصہ حذف کر دیا۔ اس کے باوجود ان کا چھوٹا سا دیوان دوسرے شاعروں کے بڑے بڑے دیوانوں کو ناک آوٹ کر دیتا ہے، کیونکہ غالب کے معیار پر پرکھا جائے تو کئی لوگوں کے دیوان کے دیوان حذف کرنا پڑیں گے، مگر مرزا کا انکسار ملاحظہ فرمائیں کہ پورا اردو دیوان مومن کے ایک شعر کے بدلے دینے کو تیار ہو گئے، وہ تو شکر ہے مومن صاحب اس تبادلے پر راضی نہیں ہوئے ورنہ آج ہمیں غالب کے بجائے مومن کو چھیڑنا پڑتا اور پھر نجانے ہمارا کیا انجام ہوتا۔ 15 فروری 1869ء کو مرزا پر موت غالب آگئی۔ مرحوم کی حقیقی اولاد زندہ نہ رہی۔ انہوں نے پس ماندگان میں دیوانِ غالب (اردو)، اردوئے معلیٰ، عود ہندی نادراتِ غالب، مکاتبِ غالب اور بے مثل ''کلیاتِ غالب'' (فارسی) چھوڑے۔

محمد خلیل الرحمٰن

دیباچہ

"غالب کے اُڑیں گے پُرزے" کی ضمن میں مرزا غالب کے کلام پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کچھ دن ہو گئے تھے اور ان کے شستہ و شائستہ کلام پر ہماری بے ہودگیوں (پیروڈیوں) کی کل تعداد تین دہائیوں سے تجاوز کر چکی تھی، ادھر ایک عدد برقی کتاب کے لیے استادِ محترم (ہمارے اکلوتے ناشر) کا اِصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے اس ادبی تقاضے نے ہمارے ذہن پر چھائی ہوئی برف کو قدرے پگھلایا تو ہم نے بالآخر ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے، سو گزری

اور ہمارے سامنے دیباچے کا سوال ایک عفریت کی شکل میں آ کھڑا ہوا۔ اس کتاب کا دیباچہ کون لکھے گا؟ دورِ حاضر کے مستند ناموں کو ٹٹولا۔ ان میں سے آدھے تو اس خرافات کو شاعری ہی ماننے پر تیار نہ ہوتے، باقی جو آدھے تھے انھیں اردو زبان کے اتنے بڑے شاعر کی بھد اُڑانے والوں میں اپنا نام شامل کرنا شاید گوارا نہ ہوتا۔ قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند کے مصداق خود ہی کچھ لکھنے کا خیال آیا اور ساتھ ہی ذہنی روبھکی (برین ویو) تو تہیہ کر لیا کہ اس کتاب کا دیباچہ جناب مرزا اسد اللہ خان غالب ہی سے لکھوائیں گے۔ اس اچھوتے خیال یعنی ناول آئیڈیا کا مآخذ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو کی تفسیر یعنی ڈیفنے ڈی موریر کا ناول "دی ہاؤس آن دی سٹرینڈ" تھا۔ آئیڈیا یہ تھا کہ میگنس سے وہ دوائی لے کر پی جائیں گے اور سیدھا "ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے" دلی جا رہیں گے۔ جونہی مرزا صاحب دربار سے فارغ ہو کر گھر پہنچیں گے، ہم ان کا انٹرویو لے ڈالیں گے جسے دیباچے کے نام سے اپنی کتاب پر چسپاں کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ اس مقصد کے لیے پہلے تو دوزخ کے لیے کال ملوائی اور منشی ہرگوپال تفتہ سے تذکرہ کر کے ان سے سفارشی رقعہ حاصل کیا کہ مرزا غالب کے چہیتے تھے۔

دِلی پہنچے اور پتہ پوچھتے پوچھتے مرزا غالب کی حویلی جا پہنچے جھٹپٹے کا وقت تھا کہ ہم نے مرزا صاحب سے ملاقات کی۔

مرزا غالب: بیس بائیس دن سے حضورِ والا روز دربار کرتے

ہیں۔ آٹھ نو بجے جاتا ہوں بارہ بجے آتا ہوں۔ یا روٹی کھانے میں ظہر کی اذان ہوتی ہے یا ہاتھ دھونے میں۔ خلاصہ یہ کہ صبح کو جاتا ہوں دوپہر کو آتا ہوں۔ کھانا کھا کر چار پانچ گھڑی دم لے کر جاتا ہوں چراغ جلے آتا ہوں۔ بھائی تمہارے سر کی قسم، رات کو مزدوروں کی طرح تھک کر پڑ رہتا ہوں۔ آج چوتھے دن فرصت پائی ہے۔ سو فرصت کیا، کھانا کھا کر لیٹا نہیں اور تم آئے۔

ہم: مرزا صاحب ہم مرزا تفتہ کی سفارش لائے ہیں۔ للہ ہماری کتاب کے لیے ایک دیباچہ لکھ دیجیے اور مرزا تفتہ کو آزردہ نہ کیجیے۔

مرزا غالب: لو صاحب، اور تماشا سنو! آپ مجھ کو سمجھاتے ہیں کہ تفتہ کو آزردہ نہ کرو۔ میں تو ان کے خط کے نہ آنے سے ڈرا تھا کہ کہیں مجھ سے آزردہ نہ ہوں۔ اب تمہاری عنایت سے وہ ایک اندیشہ تھا، رفع ہو گیا۔ خاطر مری جمع ہو گئی۔ اب کون سا قصہ باقی رہا کہ جس کے واسطے آپ ان کی سفارش کرتے ہیں۔ واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزندوں کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔ رہا دیباچہ۔ تم کو میری خبر ہی نہیں۔ میں اپنی جان سے مرتا ہوں

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں۔ اور مجھ کو معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر نماز روزہ معاف کر دیا ہے۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے۔

ہم: ہماری پیروڈیاں جو ہم نے اصلاح کے واسطے بھجوائی تھیں، آپ نے دیکھی تو نہ ہوں گی؟

مرزا غالب: بھائی تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے

وہ چلا بھی گیا ، زمانہ ہوا
میں ہی منت کشِ صدا نہ ہوا

رقم دی، دی ہوئی اسی کی تھی
سود باقی ہے، قرض ادا نہ ہوا

سکھ کا سانس آج لے لیا اس نے
آج ہی میں غزل سرا نہ ہوا

کتنا ہے خوش نصیب فون ترا
کان سے جو کبھی جدا نہ ہوا

گانا ہم نے شروع کیا تو تھا
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

کیسا محبوب پا لیا ہم نے
آج تک اپنا کچھ بھلا نہ ہوا

کتنا سادہ ہے سامنے والا
"گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا"

قرض لے کر وہ روز اکڑنے لگے
لاکھ کوشش تو کی ادا نہ ہوا

تھا خلیلؔ ایک شاعرِ محفل
پیدا اب کوئی دوسرا نہ ہوا

محمد خلیل الرحمٰن

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ کبھی اُدھار ہوتا
ہمیں سودا پورا دیتا، وہ دکان دار ہوتا

ترے باپ نے جو دیکھا، گئی جان مفت اپنی
نہ تجھے عزیز رکھتے، نہ یہ کار زار ہوتا

لڑے عاشقوں سے تیرے، یہ ہماری بدنصیبی
ہمیں عشق نے ڈبویا کہیں ایک بار ہوتا

مجھے دوستوں نے لوٹا، مجھے غیر نے کھسوٹا
مجھے کیا برا تھا لٹنا، اگر ایک بار ہوتا

تو کبھی کو چھوڑ دیتی، مری جان آ ہی جاتی
مری بات کا تجھے بھی اگر اعتبار ہوتا

کئی ایسے تھے لطیفے جنہیں میں سنا کے اُٹھا
تو کبھی تو مسکراتی، جو تجھے بھی پیار ہوتا

وہ کسی کی داتا کِل کِل، وہ ترا حساب غالبؔ
تجھے محتسب سمجھتے جو نہ شیر خوار ہوتا

محمد خلیل الرحمٰن

ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ یہاں برزخ میں کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ دلی شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینھ کی نئی صورت دن رات میں دو چار بار برسے۔ اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالا خانے کا دالان میرے بیٹھنے اُٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان کتابیں اُٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

ہم: (موقع غنیمت جان کر مسودے کی نئی کاپی مرزا صاحب کو پیش کرتے ہیں۔)

مرزا غالب: (اپنی غزلوں کی یہ درگت دیکھ کر چہرے پر ایک رنگ آتا ہے، ایک جاتا ہے) پیر و مرشد بارہ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر آپ کا خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا، کرتا گلے میں نہ تھا کہ اگر ہوتا تو تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا۔ میرا نقصان ہوتا سر سے۔

ہم جھینپ سے گئے اور اپنی اس شرمندگی کو کم کرنے کی خاطر مرزا صاحب کی تعریف کی ٹھانی۔

ہم: مرزا صاحب۔ اب تو آپ کے خوشی کے دن آنے والے ہیں جب آپ بہشت میں ڈالے جائیں گے؟

مرزا غالب: میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے، وہ حور اجیرن ہوجائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بددور وہی ایک حور۔ بھائی

ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔

جس میں سو سو برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

ہم: تو حوروں سے آپ کی اس چپقلش کی کوئی خاص وجہ؟

مرزا غالب:

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ہم: رہنے دیجیے مرزا صاحب۔ کیا جنت میں آپ کے اور رضوان کے جھگڑے کی پیش گوئی ہم بھول سکتے ہیں بھلا۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کیا آپ ہمارے لیے کچھ اپنے بارے میں کچھ فرمائیں گے۔

مرزا غالب: تم سے ملاقات کی دو ہی صورتیں تھیں تم دلی میں آ‌ؤ یا میں اردو محفل میں آؤں۔ تم مجبور میں معذور، خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔ سنو! عالم دو ہیں۔ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے (لمن الملک الیوم) اور پھر آپ جواب دیتا ہے (للہ الواحد القھار) ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۲۱۲۱؟ ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۳۱ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۵۲۲۱؟ ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈالدی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا، فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھ کڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فِگار، ہاتھ ہتھ کڑیوں سے زخم دار۔ مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل

کئی ایسے بھی جلسے ہیں کہ جب جلسے میں ہم نکلے
بہت ہم نے گنے حامی مگر پھر بھی وہ کم نکلے

ڈرے کیوں اب عوام اپنی کہ کیا رہ جائے گا گھر میں
ہماری بھتہ خوری پر ابھی سے اُن کا دم نکلے

ملامت بھی، ہزیمت بھی، شکستِ آدمیت بھی
بہت بے آبرو ہو کر سیاست میں قدم نکلے

سیاست میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو مارتے ہیں ہم کہ جس پبلک پہ دم نکلے

کہاں قصرِ صدارت اور کہاں جیلوں کے دروازے
بس اتنا جانتے ہیں ہم، کسی جانب قدم نکلے

اگر لکھوائے کوئی اب جو ''میمو'' ہم سے لکھوائے
کہ ''میمو گیٹ'' سے ہم کان پر رکھ کر قلم نکلے

خلیل اب آپ ہی کا دم غنیمت رہ گیا ورنہ
کہاں غالب کی غزلیں تھیں کہ بس اُن پر ہی دم نکلے

محمد خلیل الرحمٰن

ہوگئی۔ بے حیا ہوں۔ سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھ کڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔

ہم: مرزا صاحب! سنا ہے یہاں عالمِ برزخ میں شراب پر پابندی ہے۔ آپ یہاں اس ٹھنڈے موسم میں کیونکر گزارا کرتے ہیں؟

مرزا غالب: دیکھتے ہو۔ صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں۔ مگر ہائے آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعہ پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔ دماغ روشن ہوگیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیٔ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب، ہائے غضب ہائے غضب۔۔۔

ہم: مرزا صاحب آپ میر تقی میر کی شاعری کو کس مقام پر دیکھتے ہیں۔ گو آپ انھیں بحیثیت ایک غزل گو شاعر کے مانتے ضرور ہیں۔

ریختی کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

مرزا غالب: بھئی ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ہم: جناب ہم نے اُڑتی اُڑتی سنی ہے کہ مومن کا یہ شعر آپ کو بہت پسند تھا اور اس کے بدلے آپ اپنا آدھا دیوان دینے پر تیار تھے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مرزا غالب: مومن میرا ہم عصر تھا۔ اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ، پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی، کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان میں نہیں آیا۔ حضرت چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔ اور پھر یہ شعر تو سہلِ ممتنع کی مثال ہے۔

اس کے تڑپانے سے کم شوقِ تماشا نہ ہوا
غیر کا ہو بھی چکا اور ہمارا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ اپنے تو اُڑیں گے پرزے
دیکھنے آئے تھے وہ بھی پہ تماشا نہ ہوا

قیسِ آوارہ کی مانند سہے زخم کئی
پھر بھی کہتے ہو کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم تری بزم سے گریوں ہی نکالے بھی گئے
لیکن اتنا تو ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

اُن کے دیکھے سے تو آ جاتی تھی منہ پر رونق
کیسا بیمار ہے، اب دیکھ کے اچھا نہ ہوا

حیف تجھ پر کہ خلیلؔ ایسے ہی تک بندی میں
شاعرِ بزم ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

محمد خلیل الرحمٰن

ہم: مرزا صاحب ہمارے استاد آپ کی شاعری کو سہلِ ممتنع کی مثال سمجھتے ہیں۔ آپ ہمیں ذرا یہ تو سمجھا دیجیے کہ یہ عجیب و غریب لفظ اصل میں کیا ہے اور آپ کی شاعری کو اس سے کیا مماثلت ہے۔

مرزا غالب: پیر و مرشد سہلِ ممتنع اُس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہلِ ممتنع حسنِ کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے۔ ممتنع دراصل ممتنع النظیر ہے سعدی کے بیشتر فقرے اور شعرائے سلف نظم میں اس شیوہ کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خودستائی ہوتی ہے سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہلِ ممتنع اکثر پائے گا۔

ہم: بہر حال مرزا صاحب آپ کے خطوط میں آپ کی نثر خوب ہے۔

مرزا غالب: صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے، اتنا تو کہو کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔

ہم: مرزا صاحب آپ پر الزام ہے کہ آپ کی شاعری میں فسق و فجور کی باتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہی شعر لے لیجیے

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

یا پھر

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

آپ کیا کہیں گے اس بارے میں

مرزا غالب: صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ مزے اُڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس پر عمل رہا ہے۔

بہر حال

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

ہم: (یہ سوچ کر کہ مرزا صاحب نے شاید ہمارے تبصروں کو دل پر لے لیا ہے، انھیں خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں)

یہ مسائلِ تصوف ، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

مرزا غالب: (ہنس کر)

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

رات بہت ہو چکی تھی لہٰذا ہم نے مرزا صاحب سے اجازت لی اور عازمِ وطن ہوئے۔ مآلِ کار مرزا بھی ہماری پیروڈیوں کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ انھیں اسی طرح بغیر اصلاح کے ہی پڑھ ڈالیے۔

نوٹ: مندرجہ بالا مضمون میں ایک دو جملوں کو چھوڑ کر غالبؔ کے تقریباً تمام جملے ''انتخابِ خطوطِ غالب'' (اردو اکیڈمی سندھ مطبوعہ مارچ ۱۹۷۶ء) سے لیے گئے ہیں۔

شاہد اطہر

ذکر لال میاں کا

جیسے ہی ہم گھر میں وارد ہوتے ہیں، سکون کی تلاش میں ہمارا پہلا عمل جرابیں اتارنا ہوتا ہے۔ پھر جیب ہلکی کر کے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود ہلکے ہو گئے ہیں۔ اگر چہ ہم بٹوا رکھنے کے مرض میں نوعمری سے ہی مبتلا ہیں، پھر بھی ہماری عادت ہے کہ خاصے پیسے پتلون کی جیب میں میں رکھتے ہیں تا کہ بار بار پرس نہ نکالنا پڑے سو اس شام بھی حسبِ معمول ہم نے جیب ہلکی کی اور رقم بیڈ سائیڈ کی ٹیبل پر رکھ کر کپڑے تبدیل کرنے باتھ روم گئے۔ واپسی پر ہمیں نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ سو روپے کا ایک نوٹ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ ہم نے سر جھٹک کر اخبار کا آخری مرتبہ مطالعہ شروع کر دیا مبادا کوئی خوشخبری رہ نہ گئی ہو اور تب ہی ہمیں ہلکی سی آواز آئی۔

''ہیلو۔۔۔''

ہم نے ادھر ادھر دیکھا اور سمجھ نہ سکے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ ٹی وی بند تھا، فون آن تھا۔ بے غم نے دنیا کی سب سے عظیم ایجاد تھرمامیٹر سے اپنا منہ بند کر رکھا تھا۔ ابھی اُنہیں سوچوں میں غرق تھے کہ پھر وہی ہلکی سی سریلی آواز سنائی دی۔

ہیلو۔۔۔''

ہم پھر چونکے کیونکہ آواز ہمارے قریب سے آئی تھی۔ اگر چہ ہم جن بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے (پریوں کی بات علیحدہ ہے) پھر بھی اس آواز کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، بے خیالی میں ہماری نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے نوٹوں پر گئی تو ہمارے دیدے کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ اوپر پڑا ہوا سو کا نوٹ باقاعدہ مسکرا کر ہمیں دیکھ رہا تھا بلکہ بول بھی وہی رہا تھا۔

''پریشان کیوں ہو رہے ہو جناب عالی یہ میں ہی آپ کو ہیلو ہائے کر رہا ہوں''

پہلے تو ہم گھبرا کر بھاگنے لگے، پھر خیال آیا کہ بیٹا کیا سوچے گا۔ وہ تو ہمیں اپنے اسکول میں کسی شیر سے کم پیش نہیں کرتا جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہم لال بیگ سے بھی ڈرتے ہیں، شیر سے نہیں اور یہ کہ شیر سے جب بھی ملاقات ہوئی، اس بزدل نے ہمیشہ ہمارے اور اپنے درمیان آہنی جنگلا حائل کئے رکھا تھا۔۔۔۔ بہر کیف، ہمت کو یکجا کر کے ہم نے دوبارہ نوٹ کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

''بھئی، آپ اتنے گھبرا کیوں رہے ہیں۔۔۔۔؟''

نہیں ہم تو نہیں گھبرا رہے۔۔۔۔ لیکن تم بول کیسے سکتے ہو؟''

ہم نے بدحواسی کے عالم میں پوچھا۔

''ہم بھی منہ میں زباں رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے''

گمان سے نکل آئے تو انسان نارمل ہو ہی جاتا ہے سو ہم بھی ہو ہی گئے۔

کیا واقعی تم بول سکتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟

''لگتا ہے آپ کو کان سے میل نکالنے کی ضرورت ہے۔۔۔ ارے جناب! یہ آپ کو وہم نہیں ہو رہا، میں واقعی بول سکتا ہوں۔ لوگ تو مجھے سات پردوں میں چھپا کے رکھتے ہیں جہاں میرا دم ہی گھٹ جاتا ہے۔ آپ نے کھلی جگہ پہ ہوا لگوائی تو

میں ہوش میں آ گیا اور دل چاہا کہ بات چیت کی جائے۔۔۔۔''

''حیرت کی بات ہے، ہم نے کسی بے جان چیز کو پہلی مرتبہ بولتے ہوئے سنا ہے۔۔۔''

''بے جان۔۔۔۔۔اونہہ، نوٹ سے زیادہ جاندار چیز بھی بھلا ہوتی ہے؟؟؟؟''

اچھا یار فلسفہ نہ بولو۔۔۔۔اگر یہ میرا وہم نہیں ہے تو پھر میں بھی تم سے بات کرنا چاہوں گا''

''شوق سے کریں شاہد صاحب۔۔۔۔!''

ارے تم تو میرا نام بھی جانتے ہو۔۔۔۔؟

لوکب سے ساتھ ہوں اور یہ کون سی بڑی بات ہے میں تو لوگوں کا وہ کچھ جان لیتا ہوں جو آپ نہیں جان سکتے۔۔۔۔''

اچھا پہلے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔۔۔؟

''کیا بتاؤں۔۔۔۔؟''

یہی کہ تم وجود میں کیسے آئے۔۔۔۔؟''

''اچھا تو پھر سنیں۔۔۔۔میری پیدائش سیکیورٹی پرنٹنگ پریس میں ہوئی۔ایک بھاری بھر کم چھاپہ مشین کا رولر میرے وجود سے گزرا اور میں سفید سے سرخ ہو گیا، ظالموں نے ایک تار بھی میرے وجود میں ڈال دیا تاکہ میرے اصل ہونے کا پتہ چل سکے، یوں مجھ پہ ۱۰۰ کا ٹھپہ لگ گیا۔۔۔۔آپ کی دلچسپی دیکھ کر میں مختصراً ماں کے پیٹ کا کچھ احوال بھی سناتا ہوں۔ پہلے پہل میں لکڑی تھا، زندگی بڑی خوشگوار تھی لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے کیسا سفر کرنا پڑے گا۔پھر وہ درخت کٹا اور کٹ کر فیکٹری پہنچ گیا پھر مجھ پر جتنے ستم ہو سکتے تھے، کئے گئے۔۔۔۔میرے چیتھڑے کر دئے گئے ،کیمکلز میں ڈالا گیا اور بالآخر مجھے کاغذ بنا دیا گیا آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں امپورٹڈ ہوں۔بہرحال یہ کاغذ کی قسمت ہے کہ کوئی ڈالر بن جاتا ہے تو کوئی۔۔۔۔میں پاکستان بھیج دیا گیا اور پھر اسٹیٹ بنک کی ہدایت کے مطابق مجھے پیدا کر دیا گیا۔وہاں سے میں کمرشل بنک گیا جنہوں نے نیا ہونے کی وجہ سے مجھے اے ٹی ایم میں ڈال دیا پھر لاکھوں ہاتھوں سے ہوتا ہوا آپ تک پہنچ گیا بس یہ ہے میری کہانی۔۔۔۔

بھئی بہت خوب۔۔۔لیکن مجھ تک آنے میں کروڑوں واقعات بھی تو ہوئے ہوں گے؟"

"واقعات ہی واقعات ہیں لیکن آپ مزاح کے دلدادہ ہیں اور یہاں دکھ کی زیادہ داستانیں ہیں"

دکھی تو سارا سنسار ہے۔۔۔۔تم ہمیں اپنے واقعات سناؤ۔ ہم نے اصرار کیا ٹھیک ہے پہلے اے سی کم کرو۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔دیکھیں ناں لوگ ! مجھے تو سانس بھی نہیں لینے دیتے جس کی وجہ سے مجھے سانس کی بیماری ہو چکی ہے اور میری آنکھیں روشنی سے بہت کم دیکھتی ہیں مجھے تو فوراً نہ جانے کہاں کہاں چھپا کر رکھا جاتا ہے

کہ کہیں مجھے ہوا نہ لگ جائے آپ نے ذرا آزادی دی ہے تو جان میں جان آئی ہے

"چلو اب اپنے واقعات سناؤ، کیسا گزر رہا تمھارا سفر پھر؟؟؟

اچھا تو سنیں،،،،،سب سے پہلے نئے نوٹوں کا کاروبار کرنے والے مجھے لے اڑے

جنہوں نے میرے چند چھوٹے بھائی بنک اہلکار کی نذر کئے اور یوں میرا سفر "حرام" کام سے شروع ہوا وہاں سے میں نوٹوں کے ہار بنانے والوں کے ہتھے چڑھ گیا ذرا رکیں پہلے میں نئے نوٹوں کے کاروبار کرنے والوں کی ایک بات بتا دوں

وہ شخص پانچ وقت کا نمازی تھا اور نئے نوٹ دیتے ہوئے یعنی فروخت کرتے ہوئے اس نے اپنے ضمیر کو سلانے کے لئے بڑا آسان طریقہ اپنا رکھا تھا وہ نئے نوٹوں کے ساتھ ایک ٹافی دیتا تھا وہ بھی پچاس روپے میں جسے لینا لازمی تھا منہ سے کہتا تھا کہ نوٹ کا کاروبار حلال نہیں لیکن ٹافروخت کرنا حلال ہے،۔۔۔آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟؟؟

ہاں بھئی سمجھ رہے ہیں۔۔۔ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

پر ظالم نوٹوں کے ہار بنانے والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ مجھے پن چبھ جائے گی تو درد بھی ہوگا اور سرِعام دھوپ میں لٹا دیا نہ گرمی کا خیال کیا س نہ پلوشن کا۔۔۔وہاں سے ایک دلہن کا بھائی مجھے خرید

کر لے گیا اور پورے گھر میں نمائش کرتا رہا۔شادی کے موقع پر میں دولہا کی گردن میں لٹکا دیا گیا اور اس بد بخت نے مجھے ایسے گلے سے لگایا کہ جب تک حجلہ عروسی میں داخل نہ ہو گیا ایک منٹ بھی مجھے علیحدہ نہ کیا۔حجلہ عروسی میں جاتے ہوئے اپنی اماں کے حوالے کر دیا جس نے سب سے پہلے مجھے ہی نوچا ہمراہ میرے بھائیوں کے اور پھر ولیمہ کے روز اسی دلہن کی ہتھیلی پر رکھ دیا دلہن بھی سیانی تھی مجھے پا کر اپنے بھائی کو پارسل کر دیا اور یوں میں جہاں سے چلا تھا واپس پہنچ گیا اس مختصر سفر میں ایک بات ضرور تھی کہ مجھے ہوا ضرور لگی ورنہ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نصیب ہوتا تھا

ہر کسی کی کوشش ہوتی کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے حالانکہ میں ہوں ہی دکھاوے کی چیز۔۔

ادھیڑ عمر کی عورتیں تو باقاعدہ مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیتی ہیں لہذا کہیں پاؤڈر کی خوشبو اور کہیں پسینے کی بد بو کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن کیا کروں، میں بے بس ہوں جس کا جی چاہے، مجھے رکھ لے حالانکہ مجھے کھلی آب و ہوا ہی پسند ہے؟"

" اچھا بھائی نوٹ ! ہار کے علاوہ تمھیں کھلی ہوا کہیں نصیب ہوئی۔۔

سچ بتاؤں تو مجھے واہیات مت سمجھ لینا۔۔۔طوائف کے کوٹھے پر، وہاں تماش بین مجھے چلتے پنکھے کے ساتھ مارتے ہیں اور میں چلتے پنکھے کے پروں سے ٹکرا کر بکھر جاتا ہوں۔"

یار نوٹ صاحب تم واہیات ہی ہو گئے ہو تو ایک آدھ واقعہ ہی کوٹھے کے حوالے سے سنا دو؟"

ایک ملک صاحب ہوا کرتے تھے بلکہ اب بھی ہیں اسٹیل ملز میں ملازم تھے اور دبا کر رشوت لیتے تھے میں ان کے ہاتھ رشوت میں ہی لگا تھا لیکن جب میں ان کے گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے بڑے بھائی نیلے میاں بھی اور ہرے میاں کے بھی ڈھیر لگے ہیں شام کو میں ان کے ہمراہ کوٹھے پر تھا جہاں ان کا استقبال ایسے کیا گیا جیسے غریب ملک آئی ایم ایف کا کرتے ہیں۔ وہاں ان کا ایک ہم پلہ اور بھی آیا ہوا تھا کہ ایک نیا پروڈکٹ پیش کیا جا رہا تھا۔ان دونوں نے خار بازی سٹارٹ ہی ہرے میاں سے کی اور تھوڑی دیر میں بات نیلے میاں تک جا پہنچی نئی حرافہ اتنی ٹرینڈ کر کے میدان میں اتاری گئی تھی کہ موقعہ پاتے ہی ملک صاحب سے کہتی وہ سامنے والا تو میرا بھائی ہے، یہی جملہ وہ سامنے والے سے بھی کہتی تھی۔ دونوں عقل کے اندھے سب کچھ لٹا کے گھر کو سدھارے میں اس بڑی لڑائی میں کام نہ آیا اور بال بال بچ گیا۔ رات کے تین بجے ملک صاحب افسردہ سے گھر پہنچے تو ان کی بیچاری بیوی نے پوچھا آج پھر اتنی دیر سے گھر آئے ہیں، کہاں رہ گئے تھے؟؟۔۔۔ ملک صاحب نے جواب دیا ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، سارا وقت ہسپتال میں تھا۔۔۔۔ان کا جواب سنتے ہی ان کی بیوی جلبلا کر بولی کہ کیا ہسپتال والے اب موتیے کے گجرے بھی دینے لگے ہیں؟؟؟؟

ملک صاحب اس سوال پر تھوڑا سا ٹپٹائے مگر پھر فوراً ہی بولے تم تو خوامخواہ شک کرتی ہو ارے بھئی ہسپتال میں دوائیوں کی بو سے دماغ خراب ہو رہا تھا سو گجرے خرید لئے۔اب بیوی نے پینترا بدلا اور مطالبہ کر دیا کہ مجھے پیسے دیں منے کا دودھ ختم ہو گیا ہے۔ملک صاحب نے یہ کہہ کر جان چھڑانا چاہی کہ ادھار کر لینا جیب میں روپیہ بھی نہیں ہے کیا کروں مہنگائی کا دور ہے بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے اور وہ جو الماری میں لاکھوں پڑے ہیں وہ میرے نہیں کسی کی امانت ہیں، کل کسی سے ادھار پکڑ لوں گا۔۔۔۔بس اسی قسم کے لاکھوں قصے روزانہ دیکھتا ہوں۔ جو شرابی زمیندار ایک رات میں 2200 کی ایک "بلیک اینڈ وایٹ" پی جاتا ہے وہ مزارعے کو سو روپے دینے کا بھی روادار نہیں ہے،

"پہلے ملک صاحب کا واقعہ تو سناؤ۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

ہاں۔۔۔۔۔۔۔اتفاق کی بات ہے کہ ان کے ساتھ کافی دن رہا۔رشوت کے پیسے عجیب عجیب جگہوں پر چھپایا کرتے تھے، لہذا مجھے بھی چھپا کر بھول گئے۔۔۔آج کل وہ حاجی ہیں اور پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں"۔

"ہائیں۔۔۔یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔۔۔؟"

"جیل کی وجہ سے۔۔۔آخر کو پکڑے گئے، بالا خانے پر

سب کچھ لٹا بیٹھے لہٰذا وہ رشوت دے کر چھوٹنے کے قابل نہ رہے تھے۔

جیل میں جو پسوؤں نے کاٹا (دونوں قسم کے) خون چوسا اور ماریں پڑیں تو اللہ یاد آ گیا جیل سے نکلتے ہی حج کیا، توبہ کی اور پکے نمازی ہو گئے۔ مجھے سب کچھ یوں پتہ ہے کہ میں امام ضامن میں بندھا تھا۔"

"یار، لال میاں! کیوں یہ نام ٹھیک ہے ناں!؟؟؟

"بالکل۔۔۔ میرا اصلی نام ہی یہ ہے کیونکہ میں لال رنگ کا ہی ہوں"

"تمھیں الجھن کس وقت ہوتی ہے؟"

اس وقت جب میرا استعمال غلط ہو رہا ہو۔۔۔ مثلاً رکشے والوں کے ساتھ مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔ جب بھی کرایہ ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو رکشے والا محبت پر اتر آتا ہے چاہے کرایہ طے ہو یا نہ ہو، رکشے والا کبھی خوش نہیں ہوتا اور ہر مسافر کے ساتھ اس کی بحث، حجت سے میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ خدا کی مار روزی کما رہے ہو اور جن سے روزی حاصل ہو رہی ہے ان کی دلآزاری لازمی ہے کیا؟؟؟۔۔۔۔

پھر یہ جو سائیلنسر نکال دیتے ہیں، اس کے شور سے میں بڑا تنگ ہوں نری پلوشن ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں اور کوئی روکتا بھی ہے تو صرف دس روپوں کے لئے۔ اس کے بعد پھر یہ رواں دواں ہو جاتے ہیں اور پہلے ہی مسافر سے لڑ جھگڑ کر ادا شدہ رشوت بلکہ آئندہ دینے والی رشوت

بھی وصول کر لیتے ہیں۔۔۔ دوسرے یہ ریلوے سٹیشنوں کے قلی! توبہ ہے، یہ کسی حال میں خوش نہیں آپ انہیں پورا لال میاں ہی کیوں نہ دے دیں، آپ کی جانب ایسے دیکھیں گے جیسے آپ نے ان کے ساتھ زیادتی کر دی ہو۔۔۔ ویسے آپ کو ایک راز کی بات بھی بتا دوں، قلی کو بھی "اوپر والوں کو 20 فیصد لگانا پڑتا ہے ورنہ بیچارہ روزگار سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔

البتہ چند قلی زیادہ اسمارٹ ہوتے ہیں، وہ بوجھ نہیں اٹھاتے۔ وہ سیٹ، برتھ بلیک کرتے ہیں اور یہ وی آئی پی ہوتے

بارہ بجے

(قطعہ با تصویر)

چھوڑی گئی ہے ایک ہوائی دیار میں
سب دیکھ لیں بغور مجھے کچھ نہیں ہوا

سکھوں پہ یونہی بارہ بجے کی ہیں پھبتیاں
بارہ بجے ہیں اور مجھے کچھ نہیں ہوا

نوید ظفر کیانی

ہیں۔ کچھ کے پاس تو ذاتی کار بھی ہے البتہ اب ذرا ریلوے کے حالات بہتر ہوئے ہیں، خاص طور پر جب سے لاہور اور پنڈی میں ٹکٹ کی فروخت وغیرہ پرائیویٹ پارٹی کے پاس گئی ہے میرے خیال میں تو پورا پاکستان پرائیویٹ پارٹیوں کو ٹھیکے پر دے دینا چاہئے اس طریقہ کار میں بظاہر صرف 3 فیصد ملتا ہے جو موجودہ آمدنی سے پھر بھی زیادہ ہے۔۔۔۔ مجھے ایک بات بتائیں کہ جس کے پاس ایک بس تھی، آج وہ پچاس بسوں کا مالک بن چکا ہے اور ریلوے خسارے میں ہی ہوتا ہے۔ افسران کو صرف لال میاں سے نیلے میاں تک ہی دلچسپی ہے، پھر مجھے دکھ تو ہو گا ہی ناں۔۔۔؟"

یار لال میاں تم تو خاصے سمجھدار ہو۔۔۔۔؟؟؟؟

چھوڑیں جی سمجھدار ہوتا تو چالیس ہزار کا بانڈ بن کر "محفوظ" ہاتھوں میں ہوتا۔ اب تو چل چل کر تھک گیا ہوں۔"

تم کسی شرابی زمیندار کی بات کر رہے تھے۔۔۔؟"

کیا بات کروں جی، بس کچھ نہ پوچھیں۔۔۔۔ خود پر ہزاروں لال میاں دن میں یہ خرچ کرنے والے۔ یہ لوگ غریب مزارعوں کو ہماری ہوا بھی نہیں لگنے دیتے آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ پھتو مزارعے کی بیوی سارا دن گدھی کی طرح کام کرتی ہے اور اسے آج کل کے دور میں چھ سو روپے ماہوار ملتے ہیں جبکہ ظالم دل بہلانے کے لئے لائی گئی لڑکی کو اگلی صبح چھ ہزار ہنس کے دے دیتا ہے ان ہی باتوں کی وجہ سے

خدا کا قہر ٹوٹ رہا ہے اور اس مرتبہ اس کی ساری فصل امریکن سنڈی لے گئی، بچا کھچا لاہوری سنڈی لے گئی اب غریب مزارعوں سے کہہ رہا ہے کہ فصل تباہ ہو گئی ہے لہٰذا تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے"

لال میاں! کبھی جواریوں کے ہتھے بھی لگے؟؟؟"

"ہزاروں مرتبہ۔۔۔۔ ایک فلم ایڈیٹر تھا، اسے جوئے کا بڑا شوق تھا لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ میں ہر مرتبہ پھر اسی کے ہاتھ واپس آ جاتا تھا یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ "شارپر" تھا شارپر تاش کے پتے لگانے والے کو کہتے ہیں جو اپنی مرضی سے تقسیم کر سکتا ہے وہ شیطان اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر جاتا اور اس مہارت سے کام دکھاتا کہ خود ہارتا رہتا اور دوست کو جتوا دیتا۔ ایک مرتبہ اسی دوست سے جیتے ہوئے پیسوں کی تقسیم پہ جھگڑا ہو گیا اور دوست نے اسے چاقو مار دیا اب جہنم میں بیٹھا دوسرے دوستوں کے ساتھ شارپنگ کر رہا ہوگا۔ "سنا ہے جوا کسی کا نہ ہوا۔۔۔۔

پولیس کا ہوتا ہے۔۔۔ اب میں پولیس کے بارے میں زیادہ نہ کہوں گا، مجھے بھی اپنی عزت پیاری ہے۔"

پولیس تمھیں تو نہیں مارتی بلکہ پیار ہی کرتی ہے۔۔۔ چلو ٹریفک پولیس کے بارے میں ہی بتا دو؟

کیا بتاؤں، سب کو ہی پتہ ہے، جب سے نیا سسٹم چلا ہے ٹریفک پولیس چالان کے ساتھ جرمانہ بھی خود کرتی ہے اور بینک دوپہر کو بند ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔ بس اب میرا منہ نہ ہی کھلوائیں۔"

چلو۔۔۔ اتنا بتا دو کہ ٹریفک پولیس کی جیب سے تم کہاں جاتے ہو؟؟؟

مرغ بالٹی والوں کے گلے میں۔۔۔۔ یار! آپ کسی اور کے بارے میں نہیں پوچھ سکتے، پولیس کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ ویسے ایک بات ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ ان کو لال میاں اتنے کم تنخواہ میں ملتے ہیں کہ آپ سن کر پریشان ہو جائیں۔"

اچھا یار! پولیس کو چھوڑتے ہیں، ان سے تو مجرم کے علاوہ سب ہی ڈرتے ہیں شاباش یہ کی ہے عقل کی بات۔۔۔ ویسے تو سارے سرکاری اداروں کا یہ ہی حال ہے اور یہ باتیں سب ہی جانتے ہیں لہٰذا آپ مجھ سے ذرا "ہٹ" کر سوالات کریں"

ٹھیک یہ بتاؤ کہ تمھیں ہاتھ کا میل کیوں کہتے ہیں؟

مجھ سے پیار کی وجہ سے، جو مجھے اپنے خون سے زیادہ چاہتے ہیں، وہ یہی جملہ بولتے ہیں۔۔۔ اب کیسے سمجھاؤں کہ لوگوں کو الٹ بات کہنے کی عادت ہوتی ہے جیسے روزنامہ "جنگ" کے مشہور کالم نگار عبدالقادر حسن ''غیر سیاسی باتیں'' لکھتے ہیں جب کہ وہ ساری باتیں سیاسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔ کیا ہونقوں جیسا منہ بنا

آٹھ دس سال قبل کی بات ہے جب حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد میں کسی نے اپنی غزل برائے تنقید پیش کی .صاحب صدارت جناب ڈاکٹر احسان اکبر نے فرمایا۔۔۔اب اس غزل پر بحث کا آغاز کرتے ہیں. سب خواتین وحضرات اس غزل کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں..اس غزل کا مرکزی خیال کیا ہے، اِس پر بحث شروع کرتے ہیں!

ایک صاحب نے اس پر برجستہ کہا کہ جناب صدر۔۔۔ غزل کا مرکزی خیال تو نہیں ہوا کرتا کیونکہ یہ صنف تو مختلف موضوعات پر مشتمل ہوتی ہے۔۔۔؟؟؟

اس پر ڈاکٹر احسان اکبر نے کہا۔۔۔" آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ غزل کا کوئی مرکزی خیال نہیں ہوتا، لیکن ہم حلقے کے اجلاس میں اِسے نکالتے رہتے ہیں"

بشکریہ عزیز فیصل

کر ہمیں دیکھ رہے ہو، لگتا ہے کہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اچھا ایک مثال بھی دے دیتا ہوں، کپڑوں کے دوکانداروں کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے یہ سب بھائی ہوتے ہیں اور اپنی بہنوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک درمیانے طبقہ کی خاتون کے ہاتھ اس طرح لگا کہ وہ روزانہ خرچے میں سے کچھ نہ کچھ بچاتی اور جب اس کے پاس مجھ سمیت چار لال میاں جمع ہو گئے تو وہ ایک کپڑے کی دوکان پر سوٹ خریدنے چلی گئی ، بھائی نے اس کو خوش آمدید کہا بہن نے اسے بتایا کہ وہ غریب عورت ہے لہذا ہاتھ ذرا ہولا رکھے۔۔۔۔ بھائی جھٹ سے بولا بہن فکر نہ کریں۔ پیسہ ہاتھوں کی میل ہے ہم نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی ہم تو صرف گاہک بناتے ہیں۔۔۔۔ پھر اس بھائی نے دوسو والا سوٹ اسے چار سو میں بھیڑ دیا۔ جب وہ مجھے لے کر اپنے گھر گیا تو اس کی بیوی نے اپنی ضرورت بتاتے ہوئے لال نوٹ طلب کیا اس ڈھیٹ نے بڑے پیار سے بیوی سے کہا، دیکھو پیسہ ہاتھوں کی میل ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے ہاتھ گندے کرو۔۔۔۔ بہت سے سرکاری اہلکار بھی ہماری اس خصوصیت کی وجہ سے ہمیں رشوت کے طور پر لیتے وقت ہاتھ نہیں لگاتے بلکہ دراز کھول دیتے ہیں ویسے ہاتھ کی میل سے تشبیہ ہمیں موٹر سائیکل اور کار مکینکوں نے دی ہے۔ ان کے ہاتھوں پر جتنی میل چڑھتی ہے، اتنے ہی ہم ان کے پاس آتے ہیں۔ اب تو آپ کی ناقص عقل میں آ گیا ہوگا کہ پیسے کو ہاتھوں کا میل کیوں کہتے ہیں؟

" آ گیا لال میاں ! آ گیا۔۔۔۔ اچھا اب اپنے سفر کا احوال بیان کرو؟

ہائے کیا بیان کروں۔۔ میں تو ایک دن سفر بتاؤں تو آپ کتاب لکھ دیں گے۔ نمونے کے طور پر اختصار سے ایک دن کی روداد سناتا ہوں۔۔۔۔ صبح نیند سے بیدار ہوا تو بیگم صاحبہ مجھے نوکر کے حوالے کرتے ہوئے ڈبل روٹی انڈے لانے کو کہہ رہی تھیں۔ نوکر نے مجھے دھکا دیا اور چھٹے میں سے پانچ روپے پار کر دئے۔ بیکری میں ایک صاحب ہرے میاں سے خریداری کے لئے آئے اور بقایا کی صورت میں ان کی جیب میں چلا گیا۔ ان صاحب نے دفتر جاتے ہوئے مجھے پٹرول پمپ کے سپرد کیا، اور وہاں سے میں خفیہ طور پر کسی نذرانہ کے طور پر پیش کیا گیا وہ کوئی انسپکٹر تھا وہ مجھے لے کر کئی پٹرول پمپوں پر گیا اور میرے بھائیوں کو میرے ساتھ جمع کرتا گیا۔ لنچ کے لئے اس نے ایک فائیو سٹار ہوٹل کا انتخاب کیا اور وہاں جو عورت آئی ، وہ ہرگز اس کی بیوی نہیں تھی اس بات کا مجھے یوں یقین ہے کہ مجھے اپنی بیوی پر لوگ ضائع نہیں کرتے۔۔۔۔ ہوٹل میں انہوں نے اپنے ضروریات سے بڑھ کر کھانے منگوائے ، عورت کھاتی جاتی اور ساتھ کہتی جاتی کہ میں ڈائٹنگ پر ہوں۔ ان کی مزید گفتگو میں اس لئے نہیں بتاؤں گا کیونکہ سب سنسر ہو جائیں گی، بہر حال جب بل آیا اس نواب کے بچے نے بس عورت کو متاثر کرنے کے لے مجھے پورے کا پورا ٹپ میں دے دیا۔ ہوٹلوں کا دستور ہے کہ تمام ویٹروں کی ٹپ جمع کر کے بعد میں برابر تقسیم کر دی جاتی ہے لیکن اس بدبخت ویٹر نے مجھے راستے میں ہی جیب میں ڈال لیا اور کاونٹر پر جا کے بولا کہ بڑا ہی کمینہ شخص ہے، عورت پر ہزاروں روپے خرچ کر دئے اور ہمیں بیس روپے بھی نہ دئے۔۔۔۔ اس ویٹر کی شفٹ جلد ہی ختم ہوئی تو

تھوڑی دیر میں ویگن میں محوِ سفر تھا جہاں اس کی جیب سے دوسرے کمینے کی جیب میں جاتے ہوئے میرے موڈ پر کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔ جیب کترے نے مجھے ایک پان کی دوکان پر دے مارا اور سگریٹ لے کر چلتا بنا۔ وہیں ایک ٹیکسی رکی، صاحب نے پان سگریٹ خریدے اور ٹیلے میاں کے بدلے میں ان کی جیب میں چلا گیا۔ وہ ایک پرنٹنگ پریس جا کر لڑنے لگا کہ تین چکر لگا کر بھی ابھی تک اس کا کام نہیں ہوا۔ ٹیکسی والا اسے اس حال پر چھوڑ کر مجھے لے کر چلتا بنا۔ پھر ٹیکسی والے نے مجھے ٹیکسی میں بیٹھنے والی دو خواتین میں سے ایک کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ مجھے لے کر گھنٹوں بازار میں گھومتی رہی لیکن مجھے کسی کے حوالے نہ کیا، وہ شاید کسی کی گاہک بننا نہیں چاہ رہی تھی بلکہ بنانا چاہ رہی تھی بالآخر اس نے مجھے چاٹ والے کے حوالے کر دیا اور تیز مرچوں والے دہی بھلے مزے لے لے کر کھانے شروع کر دیے وہاں سے میں ایک نمازی کی شلوار کی جیب میں منتقل ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر ظہر کی نماز پڑھنے مسجد چلا گیا، واپسی پر نمازی بھائی کی چپل ہی چوری ہو چکی تھی، بیچارے نے مجبوراً مجھے دے کر دوسری چپل خریدی۔ چپل کی دوکان میں بھی عجیب تماشے دیکھے۔ سیل لگا کر عوام کو بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ ہائے، کیا کریں کہ عوام تو ہر جگہ بیوقوف بنائی جا رہی ہے وہاں سے میں پھر ایک خاتون کے پرس میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ اس کی جوان بیٹی تھی۔ بیٹی چاہتی تھی کہ پورا بازار ہی خرید لے اور ماں چاہتی تھی کہ اسے صرف سیر وغیرہ کے لئے ہی محدود رکھے۔ پھر بھی بیٹی نے مجھے آرٹیفشل جیولری کے عوض ضائع کر دیا۔ یہ جیولری تھائی لینڈ سے آتی ہے اور پچیس روپے میں پڑنے والی جیولری دوکان دار آرام سے لڑکیوں کو سو میں بیچ دیتا ہے۔ آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی جبکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہر "سونا" چمکنے والا نہیں ہوتا، سمجھا کریں، بہت سے سونے اندھیرے میں ہوتے ہیں۔۔۔۔ وہاں سے میں ایک بڑی بی کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ ویگن میں سوار ہو گئیں اور جس اسٹاپ پر اتریں وہاں سے گندہ ملک شیک پیا مجھے افسوس بھی ہوا کہ آخر لوگ بس اسٹاپ پر ''مٹی شیک'' کیوں پیتے ہیں خیر وہاں

درسگاہِ عہدِ نو کو چاہیئے
عصرِ نو میں جو بھی معلومات ہے
دورِ حاضر کا ہر اِک بچہ ظفر
آکٹوپس ہو تو کوئی بات ہے

نوید ظفر کیانی

مجھے خرچ کرنے کی نوبت نہ آئی اور ہرے منے سے ہی کام چل گیا۔ وہ جیسے ہی گھر پہنچیں، ان کا بیٹا میری طلب میں کھڑا تھا بہانہ یہ تھا کہ موٹر سائیکل خراب ہے لہٰذا میری ضرورت ہے ماں سے لڑ جھگڑ کر اس نے مجھے لیا اور اسی خراب موٹر سائیکل پر اپنے دوست کے ساتھ "جوا" کھیلنے چلا گیا جہاں مجھے ہار کر واپس آیا وہیں میں کسی دوسرے جواری کے ہاتھ لگ گیا جو مجھے سیدھا لے کر بھنگیوں کی بستی میں چلا گیا۔ وہاں سے میرے ساتھ ہرے میاں کو جوڑ کر

واٹ ون" کی بوتل لے کر چلتا بنا بھنگی مجھے لے کر بھاگتا ہوا ایک فائیوسٹار ہوٹل میں گیا اور پرمٹ پر مجھے اور میرے بھائیوں کو دے کر دو بوتلیں لے کر مزید گاہکوں کو بلیک کرنے چلا گیا۔ وہاں سے میں ایکسائز انسپکٹر کی جیب میں منتقل ہو گیا جس نے کچھ ہی دیر میں مجھے پھجے پائے والے کی نذر کر دیا اب میں ایک ایسے شخص کے ہاتھ لگا جس نے گھر جا کر بیوی سے کہا کہ آج کھانے کا موڈ نہیں ہے، طبیعت بوجھل ہے ٹینڈے تم ہی کھا لو اس نے بیوی سے اس رات بہت ہی جھوٹ بولے۔ بہرحال وہ کمبخت نہ سویا لیکن میں سو گیا۔۔۔ بس اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ ایک دن کی داستان ہے اور اس طرح کی سینکڑوں داستانیں ہیں۔۔۔ کیا آپ کو نیند آ رہی ہے؟؟؟۔۔۔۔۔

ہاں بھئی اب سونا چاہئے لیکن کل تم سے مزید باتیں ہوں گی اب یہ بتاؤ کہ تم اے سی میں سونا پسند کرو گے یا دراز میں۔۔۔؟

دراز میں۔۔۔ میں اپنی عادتیں خراب نہیں کرنا چاہتا ہر قسم کے موسم کو برداشت کرنا چاہئے۔۔۔ کیا آپ بجلی چوری کرتے ہیں؟"

"نہیں، بھئی۔۔۔"

آپ سمگلر ہیں۔۔۔؟

"نہیں۔۔۔"

راشی افسر ہیں۔۔۔۔؟"

"بالکل نہیں۔۔۔"

پھر بھی آپ اے سی چلا لیتے ہیں؟؟۔۔۔۔۔ مجھے پتہ ہے کہ اب آپ لاجواب ہو جائیں گے لہٰذا میں ہی چپ ہو جاتا ہوں۔۔۔ اچھا گڈ نائٹ۔۔۔۔!"

گڈ نائٹ۔۔۔۔!"

لال میاں کو دراز میں بند کیا، خاصی دیر اس کی باتوں پر غور کرتے رہے اور پھر نیند کی دیوی ہم پر مہربان ہو گئی

دوسرے دن لال میاں نے ہم سے وعدہ لیا کہ ہم انہیں خرچ نہیں کریں گیاور ہم نے بتایا کہ ہم اسے لاکھ روپے کے بدلے بھی کسی کو نہ دیں گے۔ ہم نے اسے علیحدہ سے فولڈ کر کے بٹوے میں رکھ لیا اور طے یہ ہوا کہ شام کو کہیں آرام سے بیٹھ کر اس کا انٹرویو لیا جائے گا، ابھی ہم اس سے بہت کچھ جاننا چاہ رہے تھے فرصت پھر رات کو ہی ملی اور لال میاں کو بٹوے سے نکالا تو وہ کچھ خفا خفا سے تھے۔

کیوں لال میاں! کچھ خفا خفا سے دکھ رہے ہو؟"

"میں تو بور ہو گیا ہوں۔۔۔ میری تو آپ نے آزادی سلب کر لی ہے، اس سے تو بہتر تھا کہ میں چلتا رہتا۔"

"یار ناراض نہ ہو۔۔۔ دراصل تم سے آرام سے باتیں کرنے میں مزا آتا ہے۔۔۔۔"

تو پھر کریں ناں! باتیں۔۔۔ میں بھی یہی چاہ رہا ہوں

"اچھا، یہ بتاؤ کہ تمھیں کون سا رنگ اچھا لگتا ہے؟؟؟؟"

"ہرا"

وہ کیوں۔۔۔؟

اس لئے نہیں کہ یہ میرے بڑے بھائی پانچ سو کے نوٹ کا رنگ ہے بلکہ اس لئے کہ یہ میرے باپ کا رنگ ہے"

یعنی کون۔۔۔۔؟؟

"ڈالر، جناب۔۔۔ ہماری تو قدر و قیمت بھی اس سے ہی منسلک ہے جو روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے"

"اگر تم لال میاں یعنی سو کا نوٹ نہ ہوتے تو کیا بننا پسند کرتے؟"

"آپ کو کیا ہو گیا ہے،،،، ظاہر ہے ڈالر اور کیا؟؟؟"

آخر ڈالر ہی کیوں۔۔۔؟"

"جب میں پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ جب آپ بھی پیدا نہیں ہوئے تھے، اس وقت بھی ایک ڈالر میں ایک ہی ڈالر آتا تھا، آیا کچھ عقل شریف میں؟؟۔۔۔ فرنچ فرانک بدل گیا، جرمن مارک بدل گیا اسپین کا پیسو بدل گیا، اٹلی کا لیرا بدل گیا لیکن کیا کبھی ڈالر بدلا۔۔۔؟"

"یار تم تو خاصے سمجھدار ہو۔۔۔۔"

محترم میں تو جس کے پاس بھی جاؤں وہ عقلمند ہو جاتا ہے، میں بے وقوف کیسے ہو سکتا ہوں"

اور ہاں بڑے افسران بھی مجھے پا کر خوش نہیں ہوتے۔انہیں صرف لال نیلے میاں ہی بھاتے ہیں اور انھی کو وہ چاہتے ہیں"

" تمھیں دکھ ہوتا ہے؟"

" جب افراط زر یعنی میری قدر کم ہوتی ہے یا مجھے دے کر گھوڑوں کو مربے کھلائے جائیں ،اس وقت بھی مجھے دکھ ہوتا ہے"۔

" تمھیں کب بخوشی ہوتی ہے؟"

" جب میں رزق حلال بن کر جاؤں اس وقت۔۔۔۔۔"

" تمھیں کھانے میں کیا پسند ہے"

" مجھے ہوا پسند ہے"

" تمھیں غصہ کب آتا ہے؟؟"

" جب مجھے کوئی رشوت میں کسی کو دے اور راشی آگے سے بولے کہ اسے اپنے پاس ہی رکھو، میں کوئی بھکاری تو نہیں ہوں حالانکہ سالا بھکاری سے بھی کمتر ہوتا ہے۔۔۔۔ہاں بھکاری سے یاد آیا کہ میں نے ایسے بھی بھکاری دیکھے ہیں جن کے پاس لاکھوں ہوتے ہیں لیکن مرتے فٹ پاتھ پر ہی ہیں، میرے خیال میں تو بھکاری پر بھی انکم ٹیکس لگ جانا چاہئے"

" چھوڑو یار! کیا باتیں لے بیٹھے ہو۔۔۔۔"

" یہی تو مسئلہ ہے، سچی باتیں کڑوی ہوتی ہیں اور کڑوی بات کوئی پسند نہیں کرتا۔"

" تمھیں سفر پسند ہے۔۔۔؟"

" کونسا اردو کا یا انگلش کا۔۔۔؟"

بھئی اردو کا، وہ بھی لمبا سفر۔۔۔؟"

"بہت زیادہ پسند ہے، خوب انجوائے کرتا ہوں۔لاہور سے جب لوگ مجھے مری لے کر جاتے ہیں تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا"

" تمھیں عورتیں کیسی پسند ہیں۔۔۔؟"

" انتہائی کنجوس عورتیں پسند ہیں کیونکہ مجھے ان کی قربت زیادہ دیر کے لیے ملتی ہے"

"ویسے تمھیں عام لوگوں کون زیادہ پسند ہے ، مرد یا

"آج کے کتے اور ہڈی"

" کوئی ایسا بھی ہے کہ جس کے پاس تم جاؤ اور وہ پھر بھی خوش نہ ہو؟"

"ایک نہیں ،سو ہیں ،ایک رکشے والا ،دوسرا قلی۔۔۔۔ایسے کسی بھی مزدور سے مزدوری طے کئے بغیر کام کروا کر پھر جتنے چاہے لال میاں دے دیں،وہ خوشی کا اظہار نہیں کرے گا۔۔۔۔

صورت میں۔۔۔۔"

"قرضے سے یاد آیا، تم بنکوں میں بھی قرضے کی صورت چلتے ہو؟"

"صرف امیروں کے لئے جو مجھے ہی دے کر مجھے ہی لے جاتے ہیں۔ مزے کی ایک بات بتاؤں، باقی آپ خود اندازہ لگا لیجئے گا۔۔۔۔ایک زمیندار اپنی ایک زمین کو پانچ مرتبہ قرضے حاصل کر چکا تھا بلکہ تین مرتبہ تو معاف بھی کروا چکا تھا۔ احتسابیوں کے ہاتھ چڑھا تو جانتے ہیں، کیا معلوم پڑا؟۔۔۔۔ وہ زمین جس پر وہ قرضے لئے جا رہا تھا، بیس سال پہلے وہ اسے فروخت کر چکا تھا"

"پہلے سفر کی بات ہو رہی تھی۔۔۔۔تمھیں ٹرین کا سفر کیسا لگتا ہے؟"

"اے۔سی کلاس ہو تو سفر عمدہ ، اکانومی کلاس ہو تو نرا "سفر"۔۔۔۔اس پر زیادہ نہ بولوں گا، مجھے علم ہے کہ آپ ٹرین پر پورا مضمون لکھ چکے ہیں۔"

"چلو ویگن ، سوزوکی پک اپ کے سفر کے بارے میں بتا دو؟؟"

"میں سوزوکی میں سفر کر کے بہت خوش ہوتا ہوں کہ ہم کتنے ماڈرن ہو گئے ہیں۔ تنگ سی جگہ میں مرد عورتوں کو بھی سوار کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے بدن ہزاروں مرتبہ ٹکراتے ہیں، اعتراض عورتوں کو بھی نہیں ہوتا پھر مجھے کیوں ہو۔"

"سیر گاہوں کی سناؤ۔۔۔۔؟؟"

"ہمارے ہاں صحت کے لئے سیر کم ہی ہوتی ہے، نظر بازی کے لئے زیادہ ہوتی ہے اور اکا دکا جوڑا کسی درخت کے نیچے بیٹھا بھی ہو تو پولیس کو فحش حرکات کرتا نظر آتا ہے۔ ان سے نکاح نامہ طلب کیا جاتا ہے۔ لال میاں ہو تو جان خلاصی ہوتی ہے اور اگر نہ ہو تو سیر کرنے والوں کی سیریں ہوتی ہیں۔"

"آج کل تو تم صرف کھانے پینے کے کاروبار میں ملوث نظر آتے ہو؟"

"جب دوسرے کاروبار ٹھنڈے ہوں گے تو میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟۔۔۔میری ضرورت دو کاموں بلکہ کاروباروں میں ہی رہ گئی ہے کھاؤ پیو بیمار ہو اور پھر دوائیں کھاؤ۔ نوے فیصد بیماریاں بازاری یا خراب کھانوں سے ہوتی ہیں۔ آج کل میں یا تو پھجے کے پائے جیسی جگہوں پر پایا جاتا ہوں یا پھر ڈاکٹروں کے دراز میں۔۔۔دونوں ہی جگہ ملاوٹ ہی ملاوٹ ہے۔"

"لال میاں تم تو بہت گھومتے پھرتے ہو، ہمارے ملک میں صحت کا معیار کیسا ہے؟"

"خدا کی پناہ! میں نے ایک گھر۔۔۔۔جی ہاں ایک بھی گھر ایسا نہیں دیکھا جہاں کوئی نہ کوئی بیماری نہ ہو" ہر گھر میں ایک بیمار

ایسے بھی ہیں مہرباں۔۔۔

ضرور ہے یا ایک بیماری"۔۔۔۔ پہلے چالیس سالہ جوان اکھٹے بیٹھتے تھے تو گفتگو ہوتی تھی کہ فلاں بہت حسین ہے، فلاں کے کیا کہنے، اس کا فگر تو بس قیامت ہے۔ آج کل چالیس سالہ بوڑھے گفتگو کریں گے تو یہی کہ میری کمر میں درد رہتا ہے، مجھے شوگر ہوگئی ہے، یورک ایسڈ کی وجہ سے گوشت منع ہوگیا ہے۔۔۔۔ اب آپ ہی سوچیں کہ اس بیمار قوم کا مستقبل بھی بیمار ہوگا کے نہیں؟۔۔۔۔ لڑکیوں کے قد دیکھ کر ہی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہمارا مستقبل کتنا "چھوٹا" ہوگا۔"

"تم مستقبل کی بات کر رہے ہو ہم تو حال سے بے حال ہو رہے ہیں۔۔۔۔ ویسے صحت کسی بھی قوم کے لئے سب سے ضروری ہے۔"

"بالکل۔۔۔اب دیکھیں کہ ایک حکومت نے آئی ایم ایف سے کراچی زیرِ زمین ریلوے کے لئے کھربوں روپے قرض مانگا تو پتہ ہے، انہوں نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے کہا کہ پہلے عوام کے لئے پینے کا صاف پانی تو فراہم کرلو، زیرِ زمیں ریل گاڑیاں بعد میں چلانا۔"

"یار اس ملک میں شعور ہے ہی کہاں، بس ذاتی پسند و ناپسند پر فیصلے ہوتے ہیں یا پھر تمھارے عمل دخل سے فیصلے ہوتے ہیں سیاست دانوں کے پاس رہنے کا بھی تجربہ ہوا ہوگا؟"

"لو یہ کیا بات ہوئی، میں سب سے زیادہ رہتا ہی ان کے پاس ہوں۔ لوٹے بنتے ہی میری وجہ سے ہیں، ضمیر فروخت میری وجہ سے ہوتے ہیں، انسانیت میری وجہ سے نیلام ہوتی ہے۔"

"یار تم بڑی ثقیل باتیں کرنے لگے ہو۔۔۔۔ میرا خیال ہے، اب ہمیں سوجانا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہے آپ کی بے غم بھی ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔ بس ایک گزارش ہے کی مجھے سنبھال کر رکھئے گا، آپ سے باتیں کر کے مجھے بھی مزہ آرہا ہے۔"

"ارے تم تو ایسی چیز ہو جسے کھونے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔۔ اچھا اب سو جاؤ۔ گڈ نائٹ۔۔۔!"

"گڈ نائٹ۔۔۔ سنیں۔۔۔ اس گڈ نائٹ کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟"

"شب بخیر۔۔۔"

"پھر شب بخیر بولا کریں ناں!"

"ارے یار ایک ہی بات ہے۔۔۔ مادری زبان میں نہ بولا جائے تو فادری زبان میں بول دیا۔"

"اگلے روز لال میاں کو اپنے دراز میں ہی چھوڑا مبادا بٹوے میں ان کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ دن بھر کی مصروفیات سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو لال میاں آرام سے سو رہے تھے۔"

"ہیلو لال میاں۔۔۔ ہم نے انہیں اٹھانا چاہا۔"

"اونہہ کیا بات ہے؟"

"بھئی ہم آگئے ہیں اٹھو تا کہ گپ بازی کرسکیں۔"

"مجھے تو آپ نے آرام طلب بنا دیا ہے، دل چاہتا ہے کہ آرام سے سوتا رہوں۔"

"زیادہ آرام طلبی کی تو تمھیں شوگر ہو جائے گی ذرا حرکت میں رہا کرو۔"

"یہ سامنے اخبار میں ڈاکوؤں کی کیا خبر ہے؟"

"کونسی والی۔۔۔ یہ سرکاری اہلکار والی، ڈاکٹر والی یا پولیس والی۔۔۔؟"

"وہ سامنے ڈاکوؤں والی"

"ارے بھئی کوئی خاص نہیں۔۔۔ اندرونِ سندھ میں کوئی بس لوٹی ہے۔"

"کیا اس میں سید نہیں تھے۔۔۔؟"

"کیا مطلب ڈاکوؤں کا سید سے کیا تعلق۔۔۔؟"

"ایک تو آپ کی معلومات بہت کم ہیں، مجھے حیرت ہے کہ آپ مضمون کیسے لکھ لیتے ہیں۔ لگتا ہے لکھاری آپ کی بے غم ہیں، جو آپ کے نام سے بھی لکھتی ہیں"

"یار پردہ پڑا ہے تو پڑا رہنے دو، گھر کا بھیدی کیوں لنکا ڈھا رہا ہے،۔۔۔ تم کسی سید اور ڈاکو کی بات کر رہے تھے؟"

"سندھ پر جب بھی کبھی ڈاکو کسی بس پر حملہ کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ عورتوں بچوں اور سیدوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کے

لئے انتہائی بہت تھا کہ کوئی زبان سے بول دے، میں سید ہوں، آہستہ آہستہ سیدوں کی تعداد بڑھنے لگی تو انہوں نے شناختی کارڈ چیک کرنے شروع کر دیے۔ یار لوگوں نے شناختی کارڈ پر بھی سید لکھوانا شروع کر دیا، حد تو یہ ہوگئی کہ اسی فیصد سید ہی بسوں میں سفر کرتے ہوئے پائے گئے، پھر کسی سیانے ڈاکو کی عقل شریف میں آیا تو اس نے شناختی کارڈ والے سیدوں کو لوٹنا شروع کر دیا، باقیوں کو چھوڑ دیا کرے۔"

" کسی نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے باپ دادا کی روایات کے خلاف کیوں کر رہے ہو تو اس نے صاف جواب دیا کہ جعلی سید مجھ سے بڑے ڈاکو ہیں، انہیں ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا۔"

" تم کسی ڈاکو کے گھر بھی گئے ہو۔۔۔؟"

"ہاں، اس کے گھر کی عجیب حالت ہوتی ہے، مٹی کے بنے ہوئے گھر میں زرو جواہر کے باوجود ٹوٹی ہوئی چارپائی ہوتی ہے، گھڑیوں کا انبار ہوتا ہے لیکن اس کی اپنی اوقات نہیں ہوتی۔ گھر سے جب ڈاکہ مارنے جاتا ہے تو بیوی کہتی ہے کہ بچوں کے کھلونے ٹوٹ گئے ہیں، دو چار موبائل فون چھین لانا۔ اور ہاں کئی دنوں سے زیور نہیں لائے، بیٹی نے گڑیا کی شادی کرنی ہے، منرل واٹر کی بوتلیں بھی لیتے آنا، میں کئی دن سے نہائی نہیں اور کنوئیں کے پانی سے جلد خراب ہوجاتی ہے اور ٹشو پیپر سے تو چھوٹا ناک بھی صاف نہیں کرواتا۔۔۔ بس اس قسم کی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔"

" تمھیں تو مولویوں کے ساتھ بھی وقت گزارنے کا موقع ملا ہوگا؟"

"دیکھیں جناب ڈاکو تو ڈاکو ہی ہوتے ہیں لیکن مولوی تو کئی قسم کے ہوتے ہیں، آپ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

"لال میاں کیا تفرقہ پھیلا رہے ہو؟"

"میں پھیلا رہا ہوں۔۔۔ حد کرتے ہیں آپ؟"

"اچھا کسی اور کے بارے میں بات کرتے ہیں۔۔۔"

"یہ بہتر رہے گا۔۔۔"

"تمھیں خوشبو کون سی اچھی لگتی ہے۔۔۔؟"

"اپنی ہی۔۔۔ جب میں نیا ہوتا ہوں، اس وقت میری مہک کے کیا کہنے۔۔۔ اپنے علاوہ مجھے جو خوشبوئیں پسند ہیں، ان میں پٹرول، سونا اور نوزائیدہ بچوں کے بدن کی خوشبو شامل ہے۔"

" تمھیں جانور کون سے پسند ہیں"؟

" دیمک کے علاوہ سب ہی۔۔۔ دیمک کمبخت تو مجھے کھا ہی جاتی ہے"

" تمھیں بدبو کون سی ناگوار گزرتی ہے؟"

"انسانی جسم اور پسینے کی۔۔۔ انسان کمبخت بہت گندے ہیں۔ اگر آرٹیفیشل اشیاء ان سے دور کردی جائیں تو ان میں اتنی بدبو پھیل جائے کہ عام جانور ان کے پاس نہ پھٹکیں اور اگر صابن ایجاد نہ ہوا ہوتا تو دنیا کی آبادی آدھی بھی نہ ہوتی"

" کوئی ایک واقعہ سناؤ جو تمھاری وجہ سے پیش آیا ہو اور باعثِ عبرت بھی ہو؟"

"ہزاروں بلکہ لاکھوں واقعات ہیں لیکن آپ کے فرمان پر ایک سنا دیتا ہوں۔۔۔ ان دنوں میں کراچی میں ہوا کرتا تھا ایک مشہور دماغی سرجن یعنی نیورو سرجن ہوا کرتے تھے اور وہ مجھ سے بہت بلکہ بہت ہی زیادہ پیار کرتے تھے۔ اگر کوئی روڈ ایکسیڈنٹ کا واقعہ بھی ایمرجنسی میں آجائے تو پہلے نوٹ مانگتے تھے اور مریض کو اس وقت تک ہاتھ نہ لگاتے تھے جب تک کئی بڑے نوٹ ان کی جیب میں نہ آجائیں۔ ایک مرتبہ اسی طرح کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ ان کے پاس لایا گیا۔ اس کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت پہلے نوٹ طلب کیے، لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مضروب کو انسانی ہمدردی کے تحت اٹھا لائے ہیں لہٰذا مہربانی کی جائے بعد میں اس کے لواحقین کو تلاش کر کے ان کا ایک ایک روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔ سرجن صاحب نے نہ ماننا تھا نہ مانے اور اس طرح وہ مضروب تڑپتا ہوا خالقِ حقیقی سے جاملا۔ ان لوگوں نے مضروب کے والدین کو تلاش کرنا شروع کیا اور جلد ہی پتہ چل گیا کہ وہ بے چارہ جو مرحوم ہو چکا تھا اس سرجن کا اکلوتا بیٹا تھا"

"اللہ معاف کرے تمہاری وجہ سے کیا کیا ہوتا ہے، لال میاں! تم نے تو دکھی کر دیا۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اس تیزی سے مہنگائی بڑھ رہی ہے پھر لوگ گزارہ کیسے کر رہے ہیں؟"

"یہ ایک سائیکل ہے۔۔۔۔ وہ سائیکل نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ واقعات کا اتار چڑھاؤ کا چکر ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کے ہتھے جو مریض چڑھا، وہ الیکٹریشن تھا۔ ڈاکٹر نے اسے ٹیکہ دیا۔ پھر ایک موٹر مکینک کے پاس گیا، وہاں مکینک نے اس سے جھاڑ کر اپنا حساب برابر کیا، اسی لمحے وکیل صاحب کی کار آ گئی اور انہوں نے قانون کو رام کرنے کی بات کر کے مکینک کو لوٹ لیا۔ پھر وکیل کو دوکاندار کے پاس جانا پڑا اور یوں اسی ڈاکٹر نے اپنی رقم واپس حاصل کر لی، بس یہ سائیکل ہے اور اسی طرح لوگ گزارا کر رہے ہیں"

"لال میاں تم نے خواتین کے ساتھ بھی، بہت وقت گزارا ہو گا، کچھ ان کے بارے میں بھی بتاؤ؟"

"محترم ہمارا معاشرہ جس قسم کا ہے اس میں ستانوے فیصد خواتین مردوں کی کمائی پر انحصار کرتی ہیں۔ خلیے میاں، ہرے میاں اور لال میاں ان کے ہاتھوں میں گھر کا خرچ چلانے کے لئے آتے ہیں اور لاتے ہیں ساتھ میں ٹینشن۔۔۔۔ بہر حال، عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ سمجھداری سے ہمیں خرچ کرتی ہیں۔ ان کے ذاتی خرچے مردوں کی طرح باہر کے کھانے یا پان سگریٹ نہیں ہوتے بلکہ کپڑا زیور، میک اپ ہوتے ہیں۔ چند عورتیں کماتی بھی ہیں ان میں میری وجہ سے بہت کانفیڈنس آ جاتا ہے وہ خواتین جو کسی مجبوری کی وجہ سے ہمیں حاصل کرنے کے لئے نکلتی ہیں، ان کے پاس عظمت ہوتی ہی نہیں لہٰذا میں سلام ہی نہیں کر سکتا۔۔۔۔ ویسے خواتین کم لالچی ہوتی ہیں، رشوت بھی لاکھ میں سے کم ہی لیتی ہوں گی۔ البتہ لیڈی ڈاکٹر مردوں کی طرح لوٹتی ہیں"

"لال میاں! تمھیں سیاست دان بنا دیا جائے تو کیا کرو گے؟"

"وہی جو دوسرے سیاست دان کرتے ہیں۔۔۔ اپنے ہم جنسوں کا ڈھیر لگا دوں گا۔۔۔۔"

"تمھیں برا کیا لگتا ہے؟"

"جب کوئی مجھ پر لکھ دے۔۔۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر زیادہ تر پڑھے لکھے بینک والے ہی لکھتے ہیں اور انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔۔۔۔ یہاں بھی ڈالر ہمیں مات دے گیا کبھی ڈالر پر ایک لفظ بھی لکھ دیں، ساری دنیا میں قبول نہیں کیا جاتا لہٰذا اسے گندا کرنے کی ہمت ہی نہیں کسی میں، ہمارے اوپر تو اشعار تک لکھ دیے جاتے ہیں۔۔۔۔ یہ قوم کب سدھرے گی؟"

"کبھی نہیں لال میاں! یار نیند آ رہی ہے، اب سونا چاہیے۔ چلو آج کی آخری بات، تمھاری خواہش کیا ہے؟"

"یہی کہ میری قدر بڑھ جائے، میرے بدلے کم از کم دو چار ڈالر تو ہوں، لوگ مجھے رشتوں ناطوں سے بڑھ کر چاہیں، مجھے خدا نہ مانیں، میں لوگوں کی ضروریات پوری کروں، ان کی ضرورت ہی نہ بن جاؤں۔ مجھے خون سے بڑھ کر نہ سمجھا جائے میری پرستش نہ کی جائے میرے لئے ضمیر فروخت نہ ہوں، جسم نیلام نہ ہوں۔۔۔۔"

خدا نے خوب سزا دی ہے دِل لگانے کی
کسی کا بخت ہوئیں جوتیاں زمانے کی

تمام شہر ترا وِیر بن کے ٹوٹ پڑا
ابھی تو آنکھ دبی بھی نہ تھی نمانے کی

نوید ظفر کیانی

"بہت خوب لال میاں! چلو اب سوئیں، گڈ نائٹ۔۔۔ میرا مطلب ہے، شب بخیر!"

"شب بخیر۔۔۔ کل میں آپ کو بہت سے دلچسپ واقعات سناؤں گا اور ایسی ایسی باتیں بتاؤں گا جو آپ نے پہلے کبھی نہ سنی ہوں گی بلکہ کچھ رازوں سے پردہ اٹھاؤں گا"

"بہت خوب۔۔۔ پھر تو کل میں جلد گھر آجاؤں گا۔۔۔ اچھا شب بخیر!"

"شب بخیر۔۔۔"

"اگلے دن تجسس نے کام میں جی نہ لگنے دیا بھاگم بھاگ گھر پہنچے اور جلدی ڈنر وغیرہ سے فراغت پائی تاکہ لال میاں سے فائنل راؤنڈ ہو جائے۔ پھر اسے لاکر میں رکھ دیں گے تاکہ وہ محفوظ رہ سکے ایسا نایاب نوٹ تو کسی قیمت پر نہیں مل سکتا ناں۔۔۔۔ سب تیاری کر کے دراز کھولا تو لال میاں غائب تھے، پریشان ہو گئے، پورا دراز اُلٹ دیا لیکن اُن کا نام و نشان نہ تھا۔ بے غم کو آواز دی۔

"کیا ہو گیا کیوں چلا رہے ہیں؟"

"یہ لال میاں کہاں گئے؟"

"کیا۔۔۔۔۔ لال میاں۔۔۔ کون لال میاں؟"

"ارے یہ جو میری ذاتی دراز میں سو کا نوٹ پڑا ہوا تھا؟؟؟"

"میرے پاس چینج نہیں تھا، آٹا ختم ہو گیا تو وہ منگوا لیا ہے۔۔۔!"

"غضب ہو گیا۔۔۔۔ ارے وہ بولنے والا نوٹ تھا۔۔۔۔!"

"زیادہ جاگنے سے آپ کے ذہن پر اثر ہو گیا ہے۔۔۔۔!!"

"تم نہیں سمجھو گی۔۔۔۔ کہاں سے آٹا منگوایا تھا؟"

پھر ہم نے جان توڑ کوشش کی کہ وہ ہمیں کسی طرح مل جائے لیکن وہ نہ ملا، حسرت ہی رہی۔ وہ اب جو کچھ بتانے والا تھا وہ کچھ خاص تھا، بہر حال کیا کر سکتے تھے سوائے صبر کے، سو کر رہے ہیں۔

بیسل میکڈونلڈ ہیز ٹنگس / نوید ظفر کیانی

آخری میچ

ہر سال کا ایک حصہ انگریزوں سے بھی بُرا ہوتا ہے جب تقریباً ہر سائز کے انگریز کو کرکٹ کھیلنا پڑجاتی ہے۔ فرسٹ کلاس کاؤنٹی کی وبا عین آغازِ اگست سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح در آتی ہے اور انگریزی سامراج کی طرح چھاتی چلی جاتی ہے۔ ستمبر طلوع ہوتا ہے تو تقریباً ہر منیڈ کی کوز کام ہو چکا ہوتا ہے۔

دکھانا چاہتا ہوں کہ ہم بابوں میں ابھی تک اِتنا دم خم ہے کہ اُن کی جوانی کو آئینہ دکھا سکیں۔۔۔۔!

کھیل کا اہتمام شہروں میں ہی نہیں بلکہ مضافاتی قصبوں اور گاؤں کے لشکارے مارتے سبز میدانوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ یہ کھیل اِتنی دلچسپی اور انہماک سے کھیلا اور دیکھا جاتا ہے کہ اکثر کتے بھونکنا بھول جاتے ہیں حالانکہ جمہوری کتوں کو بھونکنے کے علاوہ اور کوئی آزادی درکار نہیں ہوتی۔

مجھے تو بس سال میں ایک مرتبہ کرکٹ کی یخنی چاہئے۔۔۔۔۔ میں نے ایک انگریز کو ایک بار کہتے سُنا۔۔۔۔۔ اگر انگریز یہ یخنی پیتا رہے تو نشاہ الثانیہ کچھ دور نہیں۔۔۔۔۔!

ایک دوسرے انگریز نے نشاہ الثانیہ کے ہوتوں سوتوں کی شان میں گستاخی کی اور کہا۔۔۔۔۔ میں تو اِن کل کے لونڈوں کو

کرکٹ کھیلنے والے ہر عمر، جنس اور سائز کے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ کیا لکھا ہوتا ہے ناولوں پر۔۔۔۔۔ آٹھ سے اسی سال تک کے بزرگوں کے لئے۔۔۔۔۔ جی ہاں انگریز سال میں ایک بار بچہ بھی بن جاتا ہے خصوصاً اسی سال کا بچہ تو دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ میں نے تو اِس کا حِظ اُٹھایا ہے کیونکہ اس برس جو

ہماری کرکٹ ٹیم تھی اس کا وکٹ کیپر کم وبیش اسی عمر کا کھلاڑی تھا۔ اُسے وکٹ کیپر کے اسٹائل سے جھکنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ عمرِ عزیز نے اُسے پہلے ہی خمیدہ پشت بنا رکھا تھا۔خمیدہ پشتی کی سہولت تسلیم لیکن اگر فاسٹ باؤلر کو چھونے لڑ رہے ہوں تو بیٹسمین کے ساتھ ساتھ وکٹ کیپر کی ارادی وغیر ارادی ہل جُل میں اضافہ ناگزیر ہوتا جاتا ہے جبکہ زائد العمری پہلے ہی چولیں ہلائے دے رہی تھی نتیجتاً میلے کی اس شوقن کو عین کھیل کے دوران ہڈیوں کے ماہر سے رجوع کرنا پڑا جو آخری خبریں آنے تک اُس کے ماتھے پر وہ سینگ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا احتمال اُن باب لوگ کو گیند لگنے کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔خیر یہ تذکرہ دیگر ہے۔ فی الحال اس سال وقوع پذیر ہونے والے اُن تاریخی واقعات کا ذکر ہو جائے جب ہمیں بقلم خود اس سانحے سے گزرنا پڑا۔ جی ہاں' کہنے والے اِس کو کرکٹ میچ کہہ سکتے ہیں لیکن میرے ایک مزاح نگار دوست کو تو اس میچ کو دیکھ کر بیسیوں آئیڈیے مل گئے تھے۔

تمہیں ہر حال میں کھیلنا ہے۔۔۔۔۔ بال پارٹی کی ایک جانِ محفل نے مجھ سے فرمائش کرتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔تم جہاں چاہے فیلڈ کر سکتے ہو (جی نہیں' گراؤنڈ کے باہر ہرگز نہیں) تمہیں باؤلنگ کے لئے بھی نہیں کہا جائے گا اور اگر تم چاہو گے تو تمہیں کھیلنے کے لئے بھی آخری نمبر پر بھیجا جائے گا۔۔۔۔ہمیں دراصل دو ٹیمیں پوری کرنی ہیں۔۔۔۔!

اُس جانِ محفل کی زیبائش اور فرمائش دونوں ہی قیامت تھی لیکن چونکہ زیبائش نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی اس لئے ہمیں کھیرا بن کر چاقو کے اوپر نیچے ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوا۔

مجھے فیلڈنگ کے باب میں یہ بات پسند آئی کہ آپ جہاں چاہیں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ گویا ہم وہاں بھی کھڑے ہو سکتے ہیں جہاں کسی بیٹسمین کی جارحیت سگار کے دو ایک کش لگانے میں مانع نہیں ہو سکتی تھی لیکن باؤلنگ کے لئے نہ کہے جانے والی بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ اگر باؤلنگ ہی نہیں کی تو پھر آپ نے کرکٹ کھیلی ہے یا جھک ماری ہے۔نویں دسویں نمبر پر بیٹنگ کرنے کے

تشریح

اسکول کا اصل ہوّا ماسٹر منگل سنگھ ہی تھے۔ اُردو پڑھانے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔اُردو سبق وہ ٹھیٹھ پنجابی میں دیا کرتے تھے اور اشعار کی تشریح کرنے میں اُن کا اپنا ہی نرالا انداز تھا۔ایک بار غالبؔ کا یہ شعر آیا:

سادگی و پُرکاری، بیخودی وہشیاری
حُسن کو تغافل نے جرأت آزما پایا

اس شعر کو انہوں نے ہمیں یوں سمجھایا:

''سادگی تے اُس دے نال پُرکاری، بیخودی تے اُسدے نال نال ہوشیاری، حُسن نوں تغافل وچ کیا پایا؟ شاعر کہتا ہے اُس نے حُسن نوں تغافل دے وچ جرأت آزما پایا۔۔۔لو اینی جئی گل سی۔ غالبؔ شعر بناندا بناندا مر گیا، میں شعر سمجھاندے سمجھاندے مر جانا اے، تہاڈے کوڑھ مغزاں دے پلے لکھ نہیں پینا، اگے چلو''۔

(سادگی اور اُس کے ساتھ پُرکاری، بیخودی اور اُس کے ساتھ ساتھ ہوشیاری، حُسن کو تغافل کے اندر کیا پایا؟ شاعر کہتا ہے اُس نے حُسن کو تغافل کے اندر جرأت آزما پایا۔۔۔لو اتنی سی بات تھی۔۔۔غالبؔ شعر بناتا بناتا مر گیا، میں شعر سمجھاتا سمجھاتا مر جاؤں گا لیکن تم کوڑھ مغزوں کے پلے کچھ نہیں پڑنے کا ہے۔ آگے چلو''۔)

شہابؔ نامہ از قدرت اللہ شہاب

اپنے فوائد ہیں۔ بندہ آوٹ آف فوکس بھی نہیں ہوتا اور اگر معجزانہ طریقے سے آوٹ ہونے سے بچ رہے تو پھر اُسے ڈھٹائی کا مظاہرہ بھی نہیں کرنا پڑتا۔

اِس برس پہلی بار ہماری ٹیم نے ٹاس جیتا ورنہ ہمیشہ اس کا انجام ہٹلر کے آخری معرکے کی طرح ہوتا رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سات کھلاڑی کام آگئے۔ سکور بورڈ پر کلم کلا سات کا ہندسہ منہ چڑھا رہا تھا۔ بلکہ ہماری غیرت کو سات سلام بھیج رہا تھا۔ گویا واسطا ہر کھلاڑی توحید کا قائل رہا۔ پھر اس کے بعد آٹھویں وکٹ پر دو کھلاڑی ایلفی لگا کر جم گئے۔ ہوٹل آکسٹرا کا ایک کھلاڑی جس کا کرکٹ کے ضمن میں معاشرتی پسِ منظر خاصا مشکوک تھا کمال کی ٹانگیں توڑنے لگا۔ اُس نے آگے بڑھ بڑھ کر ہٹیں لگانا شروع کر دیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دو اوورں میں چوبیس رنز بنا ڈالے۔ اس سے پہلے کہ انگریزی نشاہ الثانیہ کے متعلق کوئی پیشگوئی کی جاتی اُس پارٹنرشپ کا ایک چکنا پات بلے کو بغل میں دبائے پویلین کی جانب آتا ہوا نظر آنے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب ڈرامے میں میری انٹری ہوتی ہے۔ میں بہت نروس تھا۔۔۔۔۔۔خیر نروس ہونے کا کیا ہے، مجھے تو اس میں ملکہ حاصل ہے (ملکہ ایلزبتھ کا اس سے کوئی علاقہ نہیں)۔ وہاں بھی نروس رہتا ہوں جہاں دوسروں کو نروس کیا جاسکتا ہے۔ میرے نروس ہونے کی وجہ وہ دوستانہ مسکراہٹیں بھی تھیں جو آلے دوالے کھڑے ہوئے فیلڈروں کے لبوں پر رقصاں تھیں۔ مجھے یہ ساری مسکراہٹیں برطانوی دفترِ خارجہ کیلوگوں جیسی لگیں جن کے ہونٹ مسکراتے ہوئے اگلے بندے کو دھیرج دیتے ہیں جبکہ ہاتھ پیٹھ پیچھے چھپی ہوئی چھری پر مزید مضبوط ہو جاتی ہے۔ اِن مسکراہٹوں سے اگرچہ فضا کو خوشگوار بنانا مقصود تھا لیکن میرا پارٹنر بھیڑئے کی طرح غرا رہا تھا۔ جونہی میں کریز پر آیا وہ مجھے یوں ہدایتیں دینے لگا جیسے بریڈمین کا پھوپھڑ ہو۔ میں نے دونوں کان کھول دئے تاکہ اگر کوئی ہدایت ایک کان سے داخل ہو تو دوسرے سے بآسانی خارج ہو سکے۔ اُس گدھے کو کیا خبر کہ میں کوئی ایسا بھی سوہن حلوہ نہیں ہوں۔ اتنی مزاحمت کو مذاق رکھتا ہوں کہ اگلوں کو ہست و بود کے ہجوں کی ادائیگی کا وقت بخوبی مل سکے۔

مجھے ایک ایسے باؤلر سے سابقہ پڑ رہا تھا جو باؤنڈری وال سے دوڑتا ہوا آتا تھا دوسری جانب والی وکٹ کے قریب آکر اچھلتا تھا اور پھر زور سے بازو گھما دیتا تھا۔ گیند دیند نہیں پھینکتا تھا لیکن وکٹ کیپر کی اچھل کود اور قریبی فیلڈروں کی زوردار ''اوہ'' سے لگتا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ یوں بھی ایمپائر اُسے اس نوع کی شرارت کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ وہ ایک فاسٹ باؤلر تھا اور وکٹ ایسی سپاٹ اور بلئر ڈ ٹیبل جیسی چکنی تھی کہ اگر میرے جیسا جیالا بھی بال کرواتا تو مائیکل ہولڈنگ سے کم خطرناک ثابت نہیں ہوتا۔ جب باؤلر دوبار اس عمل کو دھرا چکا تو مجھ کر کھلا کہ وہ گیند پھنکتا بھی ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی تیز رفتاری کے باعث کم کم نظر آتی ہے۔ اب میں سنبھل گیا اور اگلی بال کھیلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اِس بار باؤلر نے باؤنسر پھینکا۔ مجھے بال صاف دکھائی دی۔ گیند میرے سر کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ میں یکدم پُر اعتماد ہو گیا۔ اِس قسم کی گیند تو ہرا ایرا غیرا نتھو خیرا کھیل سکتا تھا۔ چوتھی گیند بھی پہلی دونوں گیندوں کی طرح نکلی۔ نہ اُن کے آنے کا پتہ چلا اور نہ جانے کا۔۔۔۔۔بس دو باتوں کا ہی نوٹس لے سکا۔ ایک تو یہ کہ گیند میں بھی کسی نوع کی برقی توانائی گھولی گئی ہے تبھی تو میری کہنی کے قریب باڑو پر زوردار کرنٹ لگا تھا۔ جو دوسری شے مجھے نظر آئی وہ میرا پارٹنر تھا جو میری طرف دوڑتا چلا آ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ چلا بھی رہا تھا۔۔۔۔۔دو۔۔۔۔۔دو۔۔۔!!!

میں سمجھا کہ وہ مجھ سے میرا بلا مانگ رہا ہے۔ میں نے اپنا بلا اُس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ میرے قریب آ کر چلانے لگا۔۔۔۔۔ ابے گدھے۔۔۔۔۔۔ بھاگتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔ رنز بناؤ رنز۔۔۔۔۔!!!

مرزا صاحب مرغن غذاؤں کے بڑے شوقین تھے، آخری ایام میں تنگدستی و مفلسی نے جب شکنجہ کسا تو شوق تو بہر حال باقی رہا مگر اس کی دستیابی ختم ہوگئی۔

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا، برتن تو بہت سے تھے مگر کھانا بہت قلیل تھا، مرزا نے مسکرا کر کہا "اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھیئے تو بایزید کا"۔

اگرچہ رنز بنانے کو کہا تو اُس نے کسی گدھے کو تھا لیکن نہ جانے میں کیوں بھاگنے لگا۔ ہم نے بھاگ کر لیگ بائی کے دو رنز بنائے جسے اگر "بازو بائی" رنز کہا جائے تو مضائقہ نہیں ہوگا بلکہ ایک طرح سے اُسے "کجن بائی" رنز بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ گیند لگنے پر جیسی پُرسوز آواز میرے منہ سے برآمد ہوئی تھی وہ صرف اور صرف کجن بائی کا خاصا ہے۔

اب باؤلر کو مزید تجربات کی سوجھی۔ اُس نے گیند کا زاویہ بدل کر اُسے مزید "اُٹھان" دینے کی ٹھانی۔ یہ اُٹھان کسی جوانی کی اُٹھان کی طرح قیامت خیز ثابت ہوئی۔ پانچویں بال نے میرے منہ کو "فٹے منہ" بنانے کی ناپاک جسارت کر ڈالی۔ اگرچہ میں نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا لیکن گیند بلیاں دے کر جانے کیسے زنان خانے میں آن گھسی اور میری ٹھوڑی کی خیریت پوچھ ڈالی۔ اس کے بعد جب میں کسی ترقی پزیر ملک کی طرح ڈگمگاتے ہوئے میں کامیاب ہوا تو پون گھنٹا گزر چکا تھا۔ باؤلر کسی نسلی انگریز کی طرح مجھ سے معذرت کرنے لگا۔ میں نے بھی کسی اصلی انگریز کی طرح اُسے دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں دیں لیکن اُوپر اُوپر سے اپنی زخمی باچھیں پھیلا پھیلا کر کہنے لگا۔۔۔۔۔۔اٹس او کے۔۔۔۔ تھینکس اینی وے۔۔۔۔۔!!

ویسے قصور تو نہ اُس کا تھا اور نہ میرا بلکہ اگر قصوروار اگر کوئی تھا تو وہ پچ تھی کہ جس نے گیند کو اِتنا اونچا اچھال دیا تھا کہ میرے ظرف سے سنبھالے نہ سنبھلا۔ اوور کی چھٹی اور آخری گیند فل ٹاس تھی۔ میں نے اُسے لیگ باؤنڈری کی طرف کھیلنے کی کوشش کی لیکن مِس کر گیا۔ اِس مس کے مسز بننے کی نوبت نہ آئی کیونکہ محترمہ نے میرے زانو پر اپنا سر رکھنے کی جسارت کر ڈالی تھی۔

ہاؤز دیٹ۔۔۔۔۔ باؤلر نے اِس کھلی فحاشی پر ایمپائر کی رائے لینی چاہی۔

اوور۔۔۔۔۔۔ ایمپائر نے تصدیق کی کہ گیند بہت اوور ہوگئی تھی۔

اوور نے جیسے میری بیٹری چارج کر کے رکھ دی۔ شکر ہے کہ ایمپائر نے اِس بال کو نو بال قرار نہیں دیا ورنہ باؤلر کو تو خون لگ گیا تھا۔ آخری بال پر میں نے جس طرح خٹک ڈانس کا ٹھمکا لگایا تھا اُس سے متاثر ہو کر باؤلر یقیناً اگلی بال بھی فل ٹاس ہی کرواتا اور صریحاً میرا تختہ دھرن کر دیتا۔

اگلے اوور کی پہلی گیند ہوئی اور دوسری طرف وکٹ کی کلی اڑ گئی۔ محترم بیٹسمین صاحب نے چھکے کی حسرت میں خودکشی فرما لی تھی۔ اب میرا مزید بیٹنگ کرنے کا موقع جاتا رہا لیکن ایک اچھے بیٹسمین کی طرح میں نے حرفِ شکایت زبان پر نہیں لایا۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ میں جم گیا تھا تو کسی بھی سیاستدان کی سچائی کو چیلنج کر سکتا ہوں تاہم جس بال پر دوسرا کھلاڑی آؤٹ ہوا تھا میں اُسے تو کم از کم پویلین کی سلامی کو تو بھیج ہی سکتا تھا۔

چونکہ مجھے "ناٹ آؤٹ" رہنے کا افتخار حاصل رہا تھا اس لئے میرے کپتان نے اپنے غازی کو بخوشی اجازت دے دی کہ وہ ہوٹل کی کسی بھی حسینہ سے کچھ دیر کے لئے اپنے دکھتے ہوئے باڑو کی مالش کرا سکے۔

ایک روز مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ، جن میں مرزا بھی تھے۔ باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے، آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدر ہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا، مرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے، بادشاہ نے پوچھا: مرزا اس طرح غور سے کیا دیکھتے ہو؟ مرزا صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: کسی بزرگ نے کہا ہے۔۔۔

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں
کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں۔ بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک ٹوکری عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی۔

اُس دن کی باقی دوپہر فیلڈنگ کرتے گزر گئی۔ دوسری ٹیم کی بیٹنگ میں کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ صورتِ حرام نوجوان جسے ہوٹل کی حسینائیں" چاکلیٹ ہیرو" اور میں پیار سے "تارا مسیح" کہہ کر بلاتا تھا' سینچری بنا گیا۔ کم بخت نے زیادہ تر شارٹس میری طرف ہی ماریں۔ میں شارٹ لیگ پر پہرہ دے رہا تھا۔ ہر بال پر دلکش اسٹائل سے غوطہ زنی فرماتا تھا لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ "انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"۔۔۔۔۔ یُوں بھی میں اگر اُس کے شارٹس روکنے لگ جاتا تو تماشائی حسینائیں صاف پہچان جاتیں کہ رقابت پر تلا بیٹھا ہوں۔ وہ کمبخت بھی شارٹس لگاتے ہوئے میرے کدو کو مدِ نظر رکھتا تھا جیسے باؤنڈری یہیں طلوع ہوتی ہو۔

کپتان نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اگر میری بے مثال فیلڈنگ جاری رہی تو اُس نامراد کی سینچری "ہزاری" میں بدل سکتی ہے' مجھے باؤلنگ پر لگا دیا۔ میں ایک وکھرے ٹائپ کا باؤلر ہوں۔ میری باؤلنگ منفرد نظریے کی حامل ہے۔ بعض حاسدوں کا خیال ہے کہ میں عموماً گلی میں کھڑے ہوئے فیلڈروں کو بلے باز سمجھ کر باؤلنگ کراتا ہوں جو کہ ایک انتہائی غلط خیال ہے۔ میں اپنے آپ کو صرف اور صرف نجیب الطرفین سمجھ کر باؤلنگ کرواتا ہوں۔ میں اپنی باؤلنگ سے کسی کو یہ سمجھنے کا موقع نہیں چاہتا کہ بچپن میں شرفاء زادوں کے برعکس بنٹے کھیلتا رہا ہوں اسی لئے نشانے سے انحراف طبقاتی تفاخر کا طرہ امتیاز سمجھتا ہوں۔

میں نے جونہی اُس صورتِ حرام کو پہلی بال کروائی' اُس نے ایک زوردار ہٹ لگائی اور حسبِ عادت گیند کا رخ میری طرف ہی رکھا۔ گیند میزائل کی طرح میرے سینے کی طرف لپکی۔

کیچ اِٹ۔۔۔۔۔۔ ہمارا کپتان چلایا۔

میں نے ایک شاندار چھلانگ لگائی' گیند پکڑنے کے لئے نہیں بلکہ اُس کی زد سے بچنے کے لئے۔ کپتان کا منہ کسی ویلش باشندے کے منہ کی طرح سُوج گیا۔۔۔۔۔ ویسے ہمارا کپتان ویلش کا باشندہ ہی ہے۔۔۔۔۔ بدخُو اور خونخوار۔۔۔۔۔۔ اب وہ مجھ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ میں نے کیچ کیوں نہیں پکڑا۔۔۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

جب گیند باؤنڈری وال سے واپس میرے قبضے میں آئی تو میں نے اُس سے کہا۔۔۔۔۔۔ یار! کیوں میری روزی روٹی کے دشمن بنے بیٹھے ہو۔۔۔۔ اگر میں اُس گیند کو کیچ کرنے کی حماقت کرتا تو اپنی تینوں انگلیاں تڑوا بیٹھتا اور اگر انگلیاں ہی نہ ہوئیں تو کیا میں ڈاکٹروں کی طرح پیروں سے لکھا کروں گا۔۔۔۔۔ اگر کسی کا ہاتھ ٹوٹ جائے یا اُس کی انگلیوں میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو لگ پتہ جاتا ہے۔ کیوں ایک کیچ کے پیچھے میری جان کے درپے ہو رہے ہو۔۔۔۔ کچھ خُدا کا خوف کرو۔۔۔۔۔۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے (ہونے والے) بیوی بچوں کے نان نفقے کی

ذمہ داری کون لے گا۔۔۔ کیا تم لوگے۔۔۔۔۔؟؟؟

اُس نے ویلش باشندوں کی طرح منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔۔۔ غالباً روایتی طور پر میرے انگریز ہونے کو ہی گالی بنایا ہوگا۔

جیسے تیسے کر کے میں نے اوور کی بقایا گیندیں بھی کروا ہی ڈالیں۔

اوور کے اختتام پر میں دوبارہ شارٹ لیگ پر فیلڈنگ کرنے لگا۔ بلے باز نے مجھ سے شرارتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور عین اگلی بال پر لیگ کی طرف گیند کی گولی داغ ڈالی۔ کچھ تو جذبہ رقابت سے مغلوب ہو کر اور کچھ کپتان کی رطب و یابس سے جھنجھلا کر میں نے اُس گیند کو روکنے کے لئے غوطہ لگایا۔ گیند کو روک تو نہ پایا ہاں البتہ اُس کا رُخ اور رفتار تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گیند نے میری ٹانگوں کے اوپر ایسے حصے میں ٹکر جڑ دی تھی کہ جس کا بیان سنسر کی زد میں آتا ہے اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اگر رہی بھی تو اِس احساس کے ساتھ کہ

زندگی درد کی تصویر بنی جاتی ہے

میری بیکسی کی شرم رکھتے ہوئے کسی دوسرے فیلڈر نے گیند اُٹھائی اور باؤلر کی طرف اُچھال دی اور یوں کھیل جاری رہا۔

جب میرے حواس نا دندگان کی طرح قابو میں آئے اور دن میں دکھائی دیے جانے والے تارے نظروں سے چھٹے تو ایک نہایت عبرت ناک منظر نظروں سے گزرا۔ وہی مردود بلے باز جس نے کافی دیر سے مجھے اپنی خباثت کا نشانہ بنا رکھا تھا ’خاک چاٹ‘ رہا تھا۔ ہماری ٹیم نے فاسٹ باؤلر نے ایسی انتقام پرور گیند کرائی تھی کہ اللہ اکبر۔۔۔۔۔ اُس نے عین جسم کا وہی حصہ تھاما ہوا تھا جس کا نشانہ مجھے بنایا گیا تھا۔ اِدھر میں اُردو کے آٹھ کا ہندسہ بنتا ہوا کھڑا ہوا اُدھر وہ سات کا ہندسہ بنتا ہوا زمین بوس ہوتا گیا۔ ایسا گرا کہ جیسے زمین پر نہ گرا ہو نظروں سے گرا ہو اُٹھ ہی نہ سکا۔

جب وکٹ کی کلیوں کو گرایا گیا تو میرا خیال تھا کہ اب اِس طویل دن کا بوریا بستر لپیٹ چکا اور میں پل صراط کا سفر طے کر چکا لیکن ایسا نہیں تھا۔ ابھی اس دن کی جگ ہنسائی کو امر بننا باقی تھا جس کا مظاہرہ ایک گروپ فوٹو کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اس واقعے کو صدیاں گزر چکیں ہیں۔ پچھلے دنوں میری ایک دوست نے جب یہ گروپ فوٹو دیکھا تو ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔۔۔۔۔ کیوں مکڈونلڈ! یہ بجوجیسا شخص کون ہے؟

میں نے لاعلمی سے شانے ہلا دیے۔ کیوں صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون تھا؟؟؟؟

ابوبکر مصور (بزم مینائی) بمبئی کی میمن برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ظاہر ہے مادری زبان گجراتی تھی لیکن عبدالرزاق سعید صاحب (عبدالاحد ساز کے والد)، تسیم مینائی، شباب مینائی وغیرہ جیسے میمن حضرات کی طرح اردو شاعری سے شغف کے سبب زبان پر عبور حاصل کیا اور بحیثیت شاعر مشہور ہوئے۔ ابوبکر صاحب لکھ پتی تھے اور ہمیشہ چار گھوڑوں کی بگھی میں سفر کرتے تھے۔ اور عموماً ’’رئیس اعظم کے نام سے مشاعروں میں پکارے جانے کو پسند کرتے تھے۔ ان کی ضد میں صبا الہ آبادی نے خود کو مشاعروں میں غریب اعظم کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ مصور صاحب نے جب اپنا دیوان ترتیب دیا تو بمبئی کے تمام شعرا کو جمع کیا بہت شاندار دعوت کی اور سب کو مجموعہ کلام کے لئے کوئی نام تجویز کرنے کی دعوت دی۔ کچھ نام بتائے گئے جو انہیں پسند نہیں آئے کہنے لگے۔ بھئی میں بال جبریل قسم کا کوئی نام چاہتا ہوں۔ منیر الہ آبادی جل گئے کہنے لگے: تو پھر تیشہ عزرائیل رکھ لیجئے۔ اس پر خوب قہقہے لگے۔

احمد علی

سانحہ نہیں ٹلتا سانحے پہ رونے سے
سیلری نہیں بچتی سالیوں کے ہونے سے

ویک اینڈ بھی اس کا لگ رہا ہے ورکنگ ڈے
جو نہ پا سکا فرصت برتنوں کے دھونے سے

اب تو میرا دشمن بھی کر کے آ گیا میرج
کچھ گلے تو کم ہوں گے ساتھ ساتھ رونے سے

جب گئی وہ میکے تو ہو گیا یہ اندازہ
کچھ سکون ملتا ہے اب سکون کھونے سے

کس ہنر سے میکے میں داستاں رقم کر لی
”میرے خونِ دل میں ہی انگلیاں ڈبونے سے“

احمد علی

” اِک اور سانحہ اس پر گزرنے والا تھا “
وہ گھر پہنچتے ہی بیوی سے پٹنے والا تھا

اسے سنبھال لیا ایک تیری آھٹ نے
وگرنہ چپکے سے گھر سے نکلنے والا تھا

” تمام شہر نے پہنے ہوئے تھے دستانے “
حالانکہ موسمِ سرما گزرنے والا تھا

اب آسماں بھی بڑا شانت ہے زمیں بھی سکھی
وہ لے کے بیوی کو سسرال جانے والا تھا

وہ تھوڑی دیر نہ ہوتی اگر خموش تو پھر
سکوت شب کی طرح میں بکھرنے والا تھا

ملے جو رستے میں آکر وہ ویر تھے اس کے
میں دشمنوں کی صفوں میں ہی مرنے والا تھا

وہ اپنے زعم میں وارث تھا میر کا لیکن
دہی دماغ کی ایک اور کرنے والا تھا

اظہر اظہر

جب سے پیدا ہوئی زنانی ہے
ہر طرف اِک نئی کہانی ہے

ایک بیگم نہ کر سکو قابو
لاکھ لعنت، یہ کیا جوانی ہے؟

کھیلنے دو قمار ہی مجھ کو
میں نے تقدیر بھی بنانی ہے

ہر پڑوسی سے اکھ مٹکا ہے
تیری جورو بڑی سیانی ہے

راستہ دے بھی دو مجھے
لوگو ایک لڑکی مجھے پٹانی ہے

اس کرکٹ کی تو چتا اظہر
سامنے رکھ کے اب جلانی ہے

اظہر اظہر

لڑکیاں قابو کرو تدبیر سے
مانگتے تعویز کیوں ہو پیر سے
مجھ کو لیلیٰ سے محبت ہو گئی
کچھ کھچاؤ سا ہوا تھا ہیر سے
بیگموں کی کیوں ڈھٹائی کا علاج
ہو نہ پائے نسخۂ اکسیر سے
گھر جمائی کم نہیں ، نعمت ہی ہے
دیکھتے کیوں آپ ہیں تحقیر سے
ٹہنیوں کی الجھنیں سلجھی نہیں
لے لیا پنگا مگر شہتیر سے
عرض کی بیگم سے بخشش کی وہیں
اک منٹ آیا تھا وہ تاخیر سے
ٹھان لی جس نے نہ سُدھرے گا کبھی
وہ بھی سُدھرا تھا فقط کفگیر سے
تُو کہاں پہنچا ہے اظہر تھا کہاں
چار لفظوں سے بجی تحریر سے

رحمان حفیظ

ہاں، نام ور رہے ہیں سدا یک بکا کے ہم
بھٹو کے کل تھے، آج ہیں جنرل ضیا کے ہم

دو تین چار فالتو سجدے بھی کر لئے
لیتے رہے مزے بھی تری اقتدا کے ہم

بدقسمتی سے ہم ذرا "مصروف" ہو گئے
ورنہ نکال دیتے عدو کے کڑا کے ہم

یاد آ گیا کہ اُلو نہیں، آدمی ہیں ہم
اُڑنے لگے تھے ورنہ ابھی پھڑ پھڑا کے ہم

کیسا عروج دیکھا اور کیسا زوال ہے
خود گر پڑے ہیں پیار کی گڈی چڑھا کے ہم

لے لے کے اس کا نام ہمیں چھیڑتے ہیں دوست
بد نام ہو گئے ہیں ٹیوشن پڑھا کے ہم

بیگم کا غصہ دیکھ کے کچھ بھیگ سے گئے
مینڈک کی طرح رہ گئے بس ٹر ٹرا کے ہم

"لو یو" کی نوبت آئی نہ سینڈل کو دیکھ کر
"آئی" ہی کہہ سکے تھے بڑے ہچکچا کے ہم

پیر ظفر کاظمی

منہ دھو کے سوٹ پہن کر گیسو سنوار کر
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کر

لینے میں ائر پورٹ پر کیوں جاؤں بار بار
آئے ہیں کون سا بھلا وہ تیر مار کر

راڈار کے اصول مطابق یہیں ہے تو
لوٹ آئے ہے صدا مری تجھ کو پکار کر

دل پر چڑھا غلاف بھی رکھ دینا ریک میں
مسجد میں جب بھی آؤ تم جوتے اتار کر

مجنوں بھی اب ملازمت پر کوریا میں ہے
لیلیٰ سوئمنگ پُول پر ہے شب گزار کر

کلیوں میں بٹ کے رہ گئے خوشبو نکھار سب
تو پیؔر اب قفس میں ہی رقصِ بہار کر

منظورؔ قاضی

تُو مِرا قاتل نہیں ہے، باوجود اس کے، کہ ہے
دل مِرا بسمل نہیں ہے، باوجود اس کے، کہ ہے

جانتے ہیں آپ جس پر آج قابض ہیں جناب
آپ کا وہ دل نہیں ہے، باوجود اسکے، کہ ہے

رہنمائے قوم کی یہ بات سب پر ہے عیاں
قوم سے غافل نہیں ہے، باوجود اس کے، کہ ہے

مصلحت کے واسطے وہ اس قدر خاموش ہے
رہنما بزدل نہیں ہے، باوجود اس کے، کہ ہے

قیس کو لیلیٰ یہ کہتی جارہی ہے بار بار
تُو مِرے قابل نہیں ہے، باوجود اس کے، کہ ہے

ہر ادا تیری مُجھے منظورؔ لیکن کیا کروں
دِل مِرا مائل نہیں ہے، باوجود اس کے، کہ ہے

حاجی گل بخشالویؔ

محفوظ رکھ خدا مرے شرم وحیا کے ہاتھ
پٹ جاؤں میں کہیں نہ کسی دلربا کے ہاتھ

انگڑائی اُس نے لی وہ ادا سے اُٹھا کے ہاتھ
دل چاہتا ہے چوم لوں جا کر خدا کے ہاتھ

واعظ بھی بھول جائے ہمیں پندو نصیحت
دیکھے وہ ایک بار تو مہر انساء کے ہاتھ

آنکھوں میں اُس کی شوخیاں مت پوچھیئے جناب
مہندی رچے وہ جب بھی ستائے ہلا کے ہاتھ

انداز ہ پھر تمہیں ہو پتنگے کے سوز کا
تم بھی کبھی چراغ سے دیکھو جلا کے ہاتھ

خوشبو بہار کی مری سانسوں میں رچ گئی
آیا ہوں جب سے پھول بدن کو لگا کے ہاتھ

بخشالویؔ تم گل نہیں خارِ ببول ہو
منہ پر وہ میرے کہہ گئی اُلٹا جما کے ہاتھ

فیضانؔ ہاشمی

کسی سے ایک کرو گے تو دوسری ہو گی
جو کر رہے ہو محبت تو خرچ بھی ہو گی

کیے ہوئے ہیں جو یہ رنگ گرتے جاتے ہیں
حضور آپ کی دیوار میں نمی ہو گی

اِک ایسے خواب میں دونوں رکے رہیں گے جہاں
ہماری آنکھ ہمیں پھر سے دیکھتی ہوگی

اسی خیال سے آیا ہے یہ خیال پسند
کہ تو ملے گا تو درپیش زندگی ہوگی

میں اس جگہ پہ کئی دشت پار کر لوں گا
یہیں پہ ہو گی ملاقات گر کبھی ہو گی

مرے فلیٹ , جو آتی ہے گھومتی سیڑھی
وہ ایک چاند کے دل میں اتر رہی ہوگی

فیضانؔ ہاشمی

ملا رہا ہوں تیرا حُسن کائنات کے ساتھ
فیزکس کھول کے بیٹھا ہوں دینیات کے ساتھ

یہ پوسٹر تو بھلا ہے مگر پڑھے لکھو !!
ذرا سا دل بھی تو رکھو قلم دوات کے ساتھ

یہ عشق ایک دیا ہر طرف دکھاتا ہے
میں جی رہا ہوں تواتر سے معجزات کے ساتھ

بہت قدیم نہیں کل کا واقعہ ہے یہ
میں اس زمین پہ اترا تھا تیری ذات کے ساتھ

گزر رہا ہوں کسی دلنشیں سرائے سے
ملا رہا ہوں میں خوابوں کو واقعات کے ساتھ

محمد ظہیر قندیل

کب وہ سنتی ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زنانی میری

یار کیبل کا اثر مجھ سے نہ پوچھ
دیکھ بھٹکی ہوئی نانی میری

ریس دے ، یار ہوئے اوجھل بھی
ہائے یہ کار پرانی میری

کون ساقرض ، پروفیسر ہوں
''بھول جانا ہے نشانی میری''

کئی دیوان کیے ہاتھ سے صاف
پھر ملی مجھ کو روانی میری

چار من وزن ہوا سُستی سے
''سخت ارزاں ہے گرانی میری''

میں جو اپنی کبھی زوجہ ہوتا
ٹوٹتی روز مدھانی میری

جوضیا دور میں کاٹی قندیل
تنگ پیری تھی جوانی میری

محمد ظہیر قندیل

روحِ فراز سے معذرت کے ساتھ

اب تو ہر چوک پہ اک خطرۂ خوں ہے ، یوں ہے
حکمراں دیتا صفائی ہے کہ یوں ہے ، یوں ہے
وہ خفا مجھ سے کہ ہے اہلِ زباں کی بیٹی
وہ کہے زوئی، کہوں میں کہ یہ ''زوں'' ہے، یوں ہے
ہو گیا سرد زمانے کی روش سے یہ ضمیر
احتجاجاً نہ چراں ہے نہ ہی چوں ہے، یوں ہے
جب سے سی این جی سٹیشنز ہوئے بند' میاں
تب سے سڑکوں پہ کہیں پاں ہے نہ پوں ہے یوں ہے
ہو گئی گرلز کالج میں ابھی چھٹی دیکھ!
راہ میں مرد یہ بیٹھا ہوا کیوں ہے، یوں ہے
ریڈیو سے خبریں نشر ہوا چاہتی ہیں
بے سبب تو نہ کئی بار یہ ٹوں ہے ، یوں ہے
بچے ننھیال گئے ، زوجہ گئیں میکے کو
ہے سکوں کتنا نہ چاں ہے نہ ہی چوں ہے، یوں ہے
ہم نے آزادی طلب کی ،ہمیں آزاد ی ملی
ہمیں آرام ہے اب ، اب نہ سکوں ہے، یوں ہے
میں پروفیسری کرتا ہوں ،گداگر ہے وہ
وہ ارب پتی مرا حال زبوں ہے، یوں ہے
ذہنی امراض کی اک وارڈ میں آ نکلا ہوں
ہیں بہت جن کو صداقت کا جنوں ہے، یوں ہے
مفلسی میں ہوئی اولاد بہت ہے، قندیل
پاس کچھ بھی نہیں بس کُن فیکوں ہے، یوں ہے

اسدؔ قریشی

سبزی سے اور دال سے وحشت اسے بھی تھی
تکوں سے اور کباب سے رغبت اسے بھی تھی

مجھ کو لبھاتی تھیں نئے کھانوں کی خوشبوئیں
اور ہوٹلوں میں کھانے کی عادت اسے بھی تھی

گھر میں پڑے پڑے تو میں اکتا گیا تھا بس
ملنے ملانے کی تو ضرورت اسے بھی تھی

خوابوں سے خواہشوں سے محبت تھی مجھ کو بھی
کارِ جہاں سے پوری فراغت اسے بھی تھی

میرا بھی کام کاج میں لگتا نہیں تھا دل
محنت کی دال روٹی قیامت اسے بھی تھی

رکھتا تھا خط چھپا کے بڑی احتیاط سے
میری طرح کسی سے محبت اسے بھی تھی

اسدؔ قریشی

لطف سمجھو زندگی کا ہم نے تو پایا نہ تھا
جب تلک تھپڑ تمھارے باپ سے کھایا نہ تھا

شادی اس نے کرلی ہے تائے کے بیٹے سے مگر
وہ تو کہتی تھی کہ اس کا کوئی بھی تایا نہ تھا

یوں ہی سب الو بناتے ہی رہے مجھ کو سدا
میں نے دیکھا سو دفعہ پھل صبر کا میٹھا نہ تھا

اس نے جب گھونگھٹ اُٹھایا دل حلق میں آگیا
دیکھ کر ابا کو بھی دل اِس طرح دھڑکا نہ تھا

میں نے سمجھا تھا کہ اس نے پھینک مارا پھول ہے
ہائے رے قسمت مری وہ پھول بھی تنہا نہ تھا

رو رہی تھی رات بھر جس سے لپٹ کر ہیر جی
درحقیقت وہ تو کیدو تھا کوئی رانجھا نہ تھا

عرفان قادر

عجیب دھرنے کا ماحول لے کے آ جائے
وہ ساتھ بینڈ کے جب ڈھول لے کے آ جائے

اب ایسے بُدھو سے عاشق کا کیا کریں گے ہم
منگاؤ برگر ،چکن رول لے کے آ جائے

پھنسی ہے دشت میں لیلیٰ ، جو ٹینک خالی ہے
کہو یہ قیس کو پیٹرول لے کے آ جائے

اکیلی ساس گر آتی تو اعتراض نہ تھا
وہ سالے سالیوں کا غول لے کے آ جائے!

کسی بھی اور شے کی اب مجھے نہیں چاہت
اُسے کہو کہ اسپغول لے کے آ جائے

چلا ہو تھانے جو انصاف لینے کی خاطر
وہ واپس آئے تو چھترول لے کے آ جائے

رقیب نامی جراثیم سے لڑائی ہے
جِتانا چاہے تو ڈیٹول لے کے آ جائے

ہو کار بنگلے کے ہمرا ہ بینک بیلینس بھی
اُسے قبول ہے بغلول ، لے کے آ جائے

کروں میں شربتِ دیدا ر پینے کی خواہش
وہ گھول پانی میں نمکول لے کے آ جائے

نکل چلو تم، اگر جان ہے عزیز تمھیں
کہیں پہ ابا نہ پستول لے کے آ جائے

ستارے توڑ کے لانے میں ہے اگر دقت
تو نارتھ جیسا ہی اک پول لے کے آ جائے

میں دے کے عقلی دلیل اُس سے کیسے جیتوں گا
ہر ایک بحث میں جو قول لے کے آ جائے

عرفان قادر

گیس ہے عنقا مرا چولھا جلانے کے لیے
ہے مگر موجود تیرے کار خانے کے لیے

راہ چلتوں سے کوئی پنگا لے اور پھر بھاگ مت
جیب میں پیسہ نہیں گر سر منڈانے کے لیے

اس قدر اونچا اُڑا بادِ مخالف سے عقاب
اُس جگہ پہنچا جہاں کچھ تھا نہ کھانے کے لیے

باز آ رشوت سے، جانے دے ہمیں، اے پُلسیے!
عاقبت برباد نہ کر چار آنے کے لیے

شہر میں پاگل بہت ہیں، ختم پتھر کیوں نہ ہوں
اک ٹرک بجری کا لے لو ہر دوانے کے لیے

چونکہ پائے میرے لیڈر کو بہت مرغوب ہیں
اُس نے کھویا کھو دیا پائے کو پانے کے لیے

ہے دبے لفظوں میں بھی انکار کرنا، بُزدلی
تھوڑی ہمت چاہیے ٹھینگا دکھانے کے لیے

ایک بلی کیا نہیں کافی تھی ایسے کام کو
پاپ سنگر نے ہیں لاکھوں خرخرانے کے لیے

ساری ٹینشن دور ہو جاتی ہے جب سُنتے ہیں ہم
شعر تیرے خوب ہیں، دل گدگدانے کے لیے

محمد قمر شہزاد آسی

تم نے جب سے کیا اشارہ ہے
میری بیگم کا ہائی پارہ ہے

کھا کے وہ دیگ پوری کہتا ہے
کچھ نہ کچھ ہو گیا گذارہ ہے

چار زوجہ حرم میں رکھتا ہے
وہ جو ایف بی پہ اک کنوارہ ہے

اس کا میسج پڑھا ہے ابا نے
حشر ہونے کو اب ہمارا ہے

جیب خالی ہو گر تو قسمت میں
کوئی سلمٰی ہے نہ ستارہ ہے

مرغ کو دیکھے عمر گذری ہے
آج کل دال پہ گذارہ ہے

شاعری کب قمر سے ہوتی ہے
منہ کا بس ذائقہ بگاڑا ہے

محمد قمر شہزاد آسی

جب بھی آکے سامنے وہ شرماتا ہے
نقشہ ذہن میں بنگلہ دیش کا آتا ہے
خوف آتا ہے دیکھ کے اسکے دانتوں کو
جانے کیوں وہ منجن سے گھبراتا ہے
ایک تو اسکی صورت بینگن جیسی ہے
اوپر سے وہ سرخی تھوپ کے آتا ہے
سو جاتے ہیں سامع پہلے مصرعے میں
جانے کس سر میں وہ گانا گاتا ہے
اپنے بچوں کی جنت کا مالک ہوں
شوہر خود کو یہ کہہ کر سمجھاتا ہے
اندھیارے میں اکثر گم ہو جاتی ہے
بیوی کا رنگ کالا مجھ کو بھاتا ہے
میرے جاں کہنے پہ ظالم بگڑا ہے
کہنے دے ظالم تیرا کیا جاتا ہے
جس پر فٹ تھی اونٹ اور رکشہ والی مثل
اب وہ بن کر دانشور سمجھاتا ہے
گپ شب دن بھر خوب لگاتی ہے بیوی
شوہر آئے جب تو سر دکھ جاتا ہے
واہ واہ کیا ہی کہنے ہیں کالے دھن کے
کل کا للو اب حاجی کہلاتا ہے
ایک تو اسکے بچے ماموں کہتے ہیں
اک یہ دل ہے اسکے ہی گن گاتا ہے
پہلے سینگ تھی جسکی محبوبہ سے
میری رہ میں وہ روڑے اٹکاتا ہے
آسی تیری اس عادت سے نالاں ہوں
کہتا ہے جب شعر تو کہتا جاتا ہے

ریاض احمد قادری

سمجھتے ہو اِسے تم بس چنے کی دال کا تڑکا
مگر ہے اصل میں یہ اک پلیٹ اور تھال کا تڑکا

نہ جانے کون سے اچھے سے والا یہ تڑکا ہے
نہ مستقبل ،نہ ماضی اور نہ ہے یہ حال کا تڑکا

کلاسیکل کا ماہر ہی ہے ٹھمری، راگ کا رسیا
لگائے نعت میں بھی ہے جو سُر اور تال کا تڑکا

سمجھتا تھا کہ ہے تقریر اب تاثیر سے خالی
لگایا مولوی نے وعظ میں اقبال کا تڑکا

بھگو کر بھیرویں کو چائے میں کلیار پیتا تھا
نہیں بھولے ابھی تک ہم اسی قوال کا تڑکا

ہے بیلنس ختم میرا اور ایزی لوڈ ناممکن
لگاتی پھر بھی ہے وہ مس مجھے مس کال کا تڑکا

برے حالات میں دیتا ہے خوش خبری زمانے کو
لگاتا ہے ترا طوطا بھی اچھی فال کا تڑکا

میں بھولا بھالا تھا معصوم تھا پکڑا گیا یونہی
لگا ڈالا ہے اس نے مجھ کو گہری چال کا تڑکا

ہوئے شادی کو جتنے سال اتنے میرے بچے ہیں
مجھے ہر سال لگتا ہے نئے اک بال کا تڑکا

نہ سولہ، سترہ سے کوئی ریاضؔ اب کام بنتا ہے
تمہارے کام آئے گا پچہتر سال کا تڑکا

ریاض احمد قادری

عجیب شخص ہے بولا ہے بکریوں کی طرح
وہ کھاتا رہتا ہے خوراک مرغیوں کی طرح

بزرگ نکلی ہے بیوی مری بڑا دکھ ہے
جو وعظ کرتی ہے ہر لمحہ بوڑھیوں کی طرح

عجب ضعیفہ خضابوں سے نوجوان بنی
لگام لال رکھے بوڑھی گھوڑیوں کی طرح

یہ خاکروبہ بھی مجھ سے فرینک رہتی ہے
وہ جیب کاٹتی ہے میری سالیوں کی طرح

یہ نوکرانی ہماری عجیب شے ٹھہری
دکھاتی ناز ہے ہر دم سہیلیوں کی طرح

ہمارے گھر کی یہ پہچان ہے محلے میں
یہاں سے بچے نکلتے ہیں ٹولیوں کی طرح

بہو بیاہ کے لائی تمہاری ماں ہے جو کل
چھلانگیں مارتی ہے وہ تو بندریوں کی طرح

ہوا وہ ماہرِ دشنام اس طرح سے ریاضؔ
ہر ایک بات نکلتی ہے گالیوں کی طرح

زبیر قیصر

محبت کی حسیں کوئی کہانی فیس بک تک ہے
مجھے لگتا ہے میری زندگانی فیس بک تک ہے

حقیقت میں تمھاری ذات پر مجھ کو بھروسہ ہے
برائے نام سی اک بدگمانی فیس بک تک ہے

تری "ڈی پی" چھپا لیتی ہے سارا بھید عمروں کا
مجھے معلوم ہے تیری جوانی فیس بک تک ہے

مری غزلیں، مری نظمیں، مرا ہر شعر "ایویں" سا
مرے لفظوں کے دریا کی روانی فیس بک تک ہے

میں اپنی ذات میں قیصرؔ بہت گم صم سا رہتا ہوں
اُسے کہہ دو، مری یہ خوش بیانی فیس بک تک ہے

محمد عاطف مرزا

رخصت اے بزمِ جہاں دفتر کو اب جاتا ہوں میں
دم نکلتا ہے مرا کیوں؟ خوف کیوں کھاتا ہوں میں؟

آرہا ہے اب دسمبر کا مہینہ اِس لیے
باس کے بچوں کی ٹیچنگ کے لیے جاتا ہوں میں

میں نے اپنے نام کو رکھا ہے اتنا فلیکسِبل
باس گر ہو شیخ تو پھر شیخ کہلاتا ہوں میں

نام پیدا کر رہا ہوں میں خوشامد کے سبب
اب تو بس مرضی کی اے سی آر لکھواتا ہوں میں

جیب میں دو سو روپے بچتے ہیں دس تاریخ کو
بیوی گر بازار کا کہہ دے تو گھبراتا ہوں میں

میں نہیں ڈرتا ہوں بیگم اور اُس کے میکے سے
اپنے چھ سالوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہوں میں

پڑھتی رہتی ہے رسالے میری بیگم ہر گھڑی
گھر کے سارے کام کرتا کرتا تھک جاتا ہوں میں

ڈاکٹر عزیز فیصل

کسی ہومیو کے حکیم سے جسے گولیوں میں دوا ملے
تو یہ کیا عجب کہ وہ قبر کی کسی اوٹ میں ہی پڑا ملے

کسی پوش مہنگے وقوع میں ہے یہ ایکڑوں کا پلاٹ ہی
کہ اگر علاقہ ہجر میں مجھے وصل خاص کی جا ملے

جہاں وائرس کی بھی خودکشی کا بجٹ ہزاروں روپے میں ہو
وہاں ہسپتال سے دو روپے میں کسی کو کیسے شفا ملے

وہ شناختی کارڈ کے دور سے بھی تھی پہلے پیدا ہوئی کبھی
اسے نادرا کے رکارڈ سے کہاں صاحباں کا پتہ ملے

تجھے علم ہے ترے پیار میں مرے دل کی کیا کیا ڈمانڈ تھی
مجھے چائے پانی کے ساتھ بھی تری چشم ناز سے کیا ملے

ڈاکٹر عزیز فیصل

جب کمی باس کے آداب میں آ جاتی ہے
غیر آسانی سی پھر جاب میں آ جاتی ہے

ہو کے جذباتی، پکڑتا ہے اسے رانجھا میاں
تیرتی بھینس جو سیلاب میں آ جاتی ہے

ہونا پڑتا ہے معلم کے مجھے زیرِ عتاب
جب بھی لغزش مرے اعراب میں آ جاتی ہے

کتنی تاثیر ہے تادیبی منکوحہ میں
بدتمیزی زد القاب میں آ جاتی ہے

اس نے تھانے میں بتایا کہ زنِ مرحومہ
دھمکیاں دینے مجھے خواب میں آ جاتی ہے

یوں مرے دل میں اترتی ہے بشیراں بی بی
مینڈکی جیسے کہ تالاب میں آ جاتی ہے

نوید ظفر کیانی

میں نظر وٹو سہی پیار ترا اور سہی
تیری سرکار میں اک چکنا گھڑا اور سہی

تیرے پیچھے مجھے پینجا ہے رقیبوں نے بہت
تیری نظروں میں مگر اہلِ وفا اور سہی

میاں مجنوں نے یوں پونی کہاں باندھی تھی کبھی
لیلیٰ اک اور سہی لیلیٰ نما اور سہی

عقد بھی کرنا پڑا ہے مجھے محبوبہ سے
عشق کے بعد مری ایک سزا اور سہی

کوئی ناراض ہے آئینہ دکھا دینے پر
خیر اس پر ہو بصد شوق خفا اور سہی

میری تنخواہ سے گر میچ کرے تو بے شک
عشوہ و غمزہ و نخرہ و ادا اور سہی

لیڈروں نے تو لگا رکھا ہے آگے کب سے
راستہ تو بھی کوئی مجھ کو دکھا اور سہی

بھوت لاتوں کا ہے باتوں سے کہاں مانتا ہے
سو ترے واسطے خوراک دوا اور سہی

میں ظفرؔ ہوں مجھے تم لوگ ڈفر مت بولو
لینے والوں نے مرا نام لیا اور سہی

نوید ظفر کیانی

پیر سالی میں غمِ زلفِ گرہ گیر بھی تھا
کسی خاتون کو یوں شکوۂ تقدیر بھی تھا

زن مریدی میری فطرت کا تقاضہ ہی نہ تھی
امنِ خانہ کے لئے نسخۂ اکسیر بھی تھا

اپنے نسخوں کی ہی ڈوزوں پہ دھرے رکھتے ہیں
میں بپے چارہ گراں صورتِ کشمیر بھی تھا

ایک ہی صف میں کھڑے تھے یہاں محمود و ایاز
زن مریدی میں مریدوں کی طرح پیر بھی تھا

کیپ رکھی تھی جو سر پر تو وجہ تھی یہ بھی
دستِ زوجہ میں شبِ رفتہ کو کفگیر بھی تھا

دل کا اسکین کیا ہے تو کھلا ہے ہم پر
غمِ لیلیٰ بھی تھا مجنوں کو غمِ ہیر بھی تھا

آج تک بات نہ مانی تھی کسی کی جس نے
بات بے بات پہ وہ مائلِ تقریر بھی تھا

کوئی بہرہ ہو تو ممکن ہے کہ بے بہرہ ہو
ورنہ شاعر کو جو ٹکرا وہی نخچیر بھی تھا

آپ نے بھانڈ ہی سمجھا تو ظفرؔ کیا کرتا
اِن کا اندازِ سخن یوں تو ہمہ گیر بھی تھا

روبینہ شاہین بیناؔ

برفیاں بھی زخمی ہیں ، گلگلے بھی زخمی ہیں
توند کی لڑائی میں کوفتے بھی زخمی ہیں

اِک سیاسی جلسے میں بٹ رہا ہے کھانا یوں
ایسی دھینگا مشتی میں پلسیئے بھی زخمی ہیں

نو بیاہتا دُلہن کے ہاتھ کا جو کھایا ہے
توند سر پٹختی ہے ہاضمے بھی زخمی ہیں

جس سے چیٹ کر بیٹھو نامُراد عاشق ہے
فیس بک پہ جانے کیوں فیکئے بھی زخمی ہیں

بن سنور کے نکلا ہے گھر سے برگری بچہ
جینز بھی پرانی ہے پائنچے بھی زخمی ہیں

قید کر کے رکھا جو میں نے چند مرغوں کو
مرغیاں بھی زخمی ہیں ٹوکرے بھی زخمی ہیں

ڈرائنگ خوب کرتی ہے اب تو مس بشیراں بھی
کاپیاں بھی زخمی ہیں ،حاشیے بھی زخمی ہیں

عاشقوں کی خاطر بھی خوب ہو گئی بیناؔ
چھوکری کے سینڈل سے چھوکرے بھی زخمی ہیں

روبینہ شاہین بیناؔ

تین زوجاؤں سے گو دوچار ہے
چار کرنے کو مگر تیار ہے
زن مریدی کی اُسے ڈگری ملی
اپنی بیگم کا جو تابعدار ہے
رو رہا ہے راگ میں بے بی مرا
فن بتاتا ہے کہ یہ فن کار ہے
مانتا ہے بات بیگم کی سدا
اس کے آگے بولنا بے کار ہے
توڑتا ہے دل بھی ظالم اس طرح
جس طرح کہ یہ ثواب کار ہے
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا ہے سچ
ہر طرف ہی جھوٹ کا بیو پار ہے
اس کا رشتہ پھر بھلا کیسے نہ ہو
جاب ہے کوٹھی ہے لمبی کار ہے
فیس بک پر آن ہے وہ رات دن
کون کہتا ہے کہ وہ بے کار ہے
خان صاحب نے بتایا قوم کو
اپنا میزائل یہی نسوار ہے
ہم اسے کھوتا کرولا کیوں کہیں
گیس اور پٹرول کے بن کار ہے
کہہ رہا ایک دولہا نیند میں
ہاں میرا انکار ہے، انکار ہے
ہم لگا دیتے ہیں قلب و جان کیوں
عشق تو مندے کا کاروبار ہے
بات اچھی تری ہے بیناؔ
مگر زر نہ ہو تو زندگی آزار ہے

نوید صدیقی

مہنگا بہت برات کا کھانا پڑا ہمیں
کھاتے ہی ہسپتال کو جانا پڑا ہمیں
بس یہ ہوا گٹر کو کھلا دیکھ نہ سکے
صابن سے باربار نہانا پڑا ہمیں
یوں گیارہ سال میں ہوئی کرکٹ کی پوری ٹیم
ہرسال جب کہ ایک "نیانا" پڑا ہمیں
بجلی جب اپنے وقت سے پہلے ہی آگئی
"بستی کا ہرچراغ بجھانا پڑا ہمیں"
افسر کا حکم تھا سو ہمیں ماننا ہی تھا
گاڑی کو اس کی دھکا لگانا پڑا ہمیں
زوجہ جب ان کو چھوڑ کے میکے چلی گئی
بچوں کو پھر پکا کے کھلانا پڑا ہمیں
بے وزن شاعروں نے کیا خوب مضطرب
بزمِ سخن میں خود کو گھلانا پڑا ہمیں
آئی نہ عمر بھر ہمیں سنجیدہ شاعری
سو! بھانڈ پن سے کام چلانا پڑا ہمیں
چند سال میں ہی مالِ وراثت تمام شد
پھریوں ہوا کہ خود سے کمانا پڑا ہمیں
شاپر نہ مل سکا ہمیں خیرات کے لیے
لینے کو اپنا ہاتھ بڑھانا پڑا ہمیں
آئے تھے یار لوگ سبھی ڈفلیوں کے ساتھ
محفل میں اپنا راگ بجانا پڑا ہمیں
کتوں کو خود سے دور جو رکھنا تھا سو نوید
شب بھر دیارِ یار میں گانا پڑا ہمیں

نوید صدیقی

اوپن ہے زباں ، ذہن مگر لاک بہت ہے
حل کوئی نہیں دیتا یہاں، ٹاک بہت ہے

رٹ میری مرے گھر میں حکومت کی طرح ہے
چلتا نہیں بس زوجہ پہ گو دھاک بہت ہے

گو ایک صدی بیت چلی ختم ہوئے کب؟
چمچوں کا مرے ملک میں اسٹاک بہت ہے

انسان نظرآتا نہیں فرشِ زمیں پر
سنتے ہیں کہ وہ دفن تہِ خاک بہت ہے

کھاتا ہے بہت میکہ وسسرال کے چکر
شوہر تو ہے کم کم وہ شٹل کاک بہت ہے

شاہین فصیح ربانی

کہہ دو یہ حاکموں سے کہ سائل نہیں ہوں میں
اُن کے کسی بھی فعل میں شامل نہیں ہوں میں
جو پوچھنا ہے' مجھ سے دھڑلے سے پوچھیے
ڈگری خرید رکھی ہے، جاہل نہیں ہوں میں
کی اس نے خودکشی، یہ زمانے کو ہے خبر
جاناں تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہوں
دکھلا رہا ہے موتیا آنکھوں میں اب بہار
اب تو تمہاری دید کے قابل نہیں ہوں میں
نازاں تو ہونا چاہیے کچھ میرے ساتھ پر
لیکن تمہارے پاؤں کی پائل نہیں ہوں میں
رستہ ہوں یا کہ سیڑھی کا اک پائیدان ہوں
یہ جانتا ہوں' آپ کی منزل نہیں ہوں میں
ہر دم رکھا ہے پیشِ نظر آپ کا مفاد
اور آپ کہہ رہے ہیں کہ "لائل" نہیں ہوں میں
تقسیم کا عمل ہوں' میں تفریق کا جواب
تم ایسا ضرب و جمع کا حاصل نہیں ہوں میں
قربان شاہِ وقت کرے مجھ پہ تاج و تخت
لیکن عذارِ حسن کا اک تِل نہیں ہوں میں
کیوں مجھ کو دیکھتے ہی پریشاں ہو تم فصیح
بجلی کا' آب و گیس کا تو بل نہیں ہوں میں

عتیق الرحمٰن

زندہ رہنے کے لئے گھر بار ہونا چاہیے
زندگی پُرلطف ہو ، دلدار ہونا چاہیے

اتنی بے پردہ ہوئی ہیں آج کل کی بیبیاں
آدمی کو خود ہی پردہ دار ہونا چاہیے

عافیت سے زندگی گزرے، ہے اس کا اک اصول
آدمی بیوی کا خدمتگار ہونا چاہیے

لُوٹتے ہو جس دھڑلے سے سدا تم بزم کو
آدمی اس کے لئے جی دار ہونا چاہیے

جب بھی دیکھا ہے تمہیں آیا ہمیں یہ ہی خیال
ایک دنگل خوب کانٹے دار ہونا چاہیے

شعر کی ملتی نہیں ہے داد آسانی سے اب
داد لینی ہو تو تھانیدار ہونا چاہیے

داد تم لیتے رہے ہو عمر بھر، پھر بھی طلب
آدمی کو کچھ تو عزت دار ہونا چاہیے

داد تم کو بھی ملے گی دوسروں کو کھل کے دو
کچھ تو شاعر کا بھی کاروبار ہونا چاہیے

ہوگئی ہے اِس غزل کی جس قدر قیمت وصول
اب مجھے بھی ایک ساہوکار ہونا چاہیے

شاہد عدیلی

ہڑپ لیا ہے جہاں سے جدھر جدھر سے ملا
سبق یہ مجھ کو سیاست کے بازیگر سے ملا

تجھے یہ لہجہ تعفن بھرا کدھر سے ملا
یہ آبِ فکر بتاؤ کہ کس گٹر سے ملا

بچے کھچے تھے جو کچھ دانت جھڑ گئے وہ بھی
غضب ہوا جو میں دانتوں کے ڈاکٹر سے ملا

مٹھاس آ گئی ہے اب جو اُس کے لہجے میں
یقیں ہے لہجہ یہ بیماریٔ شکر سے ملا

کھلی ہے ہیچ مدانی بیاض میں اُس کی
جو حرفِ شین ہے مرشد کا وہ زبر سے ملا

لگانا جھاڑو ، پکانا ، سنبھالنا بچے
ہنر یہ مجھ کو مرے شیر خاں خُسر سے ملا

ہیں دو اساتذہ اُس کے تو فکر کا ہے کی
کلام اِدھر سے ملا کچھ، کبھی اُدھر سے ملا

کچھ ایسی کھجلی تھی جو سو نہیں سکا شب بھر
''تمام شب کا ستایا ہوا سحر سے ملا''

مفاعلن ، فعلاتن ، مفاعلن شاہدؔ
عروض کا یہ مرض مجھ کو اپنے گھر سے ملا

شاہد عدیلی

جب بھی گھر سے کوئی فرمائشی کال آتا ہے
مسکراتے ہوئے چہرے پہ زوال آتا ہے

موںڈھ دوں بیوی کے سر کو یہ خیال آتا ہے
کھانا کھاتے ہوئے کھانے میں جو بال آتا ہے

بعد شادی کے الگ ہو گئے دونوں بیٹے
نہ جمال آتا ہے ملنے نہ کمال آتا ہے

نوجواں آج کے ہیں اُردو گھرانے کے مگر
دال لکھنا اُنہیں آتا ہے نہ ذال آتا ہے

جھریاں چہرے کی میک اپ سے نہیں چھپ سکتیں
عمر ڈھلتی ہے تو چہرے پہ زوال آتا ہے

ہٹا کٹا ہے سمجھ میں نہیں آتا پھر بھی
ٹالتا کیوں ہے جو شادی کا سوال آتا ہے

شیر بازار کے دلال اچھلتے ہیں بہت
شیر بازار میں جس وقت اچھال آتا ہے

پول معشوق کا بیوی پہ نہ کھل جائے کہیں
''پھول چنتا ہوں تو کانٹوں کا خیال آتا ہے''

لوٹتے لوٹتے جاتے ہیں زنانے کی طرف
جب بھی مرشد کو میاں وعظ میں حال آتا ہے

دیکھ کر یوں نہ ہنسو میرے لُفن کو شاہدؔ
بڑی مشکل سے میاں رزقِ حلال آتا ہے

عبدالحمید ساز

ہے پانچویں بیوی جسے ڈر کر نہیں بدلا
اس نے بھی چھٹا میں ہوں جو شوہر نہیں بدلا

ڈھوتا ہوں اُسی آٹے کی بوری کو ابھی تک
اس نے بھی پرانا میں کنستر نہیں بدلا

بیوی سے مری کہتی ہے وہ پہلی ستمگر
سن ساٹھ کا تم نے کلنڈر نہیں بدلا

آفر تھا کہ لے جاؤ نیا دے کے پرانا
شوہر وہ بدل لائی ، کبوتر نیں بدلا

سووت ہوں اوہی ٹوٹی سی کھٹیا پہ ابھوں تک
او کا بھی تو مہرارو نے چادر نہیں بدلا

چمٹا کبھی بیلن کبھی انڈا کبھی ڈنڈا
کیوں ساز کبھی اس نے ترا سر نہیں بدلا

اقبال شانہ

آج بھی چلتی ہے آدم کے زمانے کی مشین
کار ہے اُن کی پرانے کارخانے کی مشین

ایک بھی مچھر نہیں آتا ہے میرے آس پاس
مل گئی جب سے مجھے مچھر بھگانے کی مشین

ہو گئی غائب نہ جانے آج وہ دھوبن کہاں
آگئی کم بخت یہ دھونے دھلانے کی مشین

جب سے شادی ہو گئی یہ حال میرا ہو گیا
بن گیا ہوں دوستو کھانا پکانے کی مشین

چھت پہ وہ آتا نہیں ہے زلف بکھرائے ہوئے
مل گئی ہے یار کو زلفیں سکھانے کی مشین

مل رہا ہے وہ رقیبوں سے گلے بے اختیار
یار نے گویا چلا دی دل جلانے کی مشین

گنگنائے جا رہے ہیں اپنی دھن میں آج وہ
کان سے اُن کے لگی گانے بجانے کی مشین

سُن کے میری شاعری یہ کہہ رہے ہیں سامعین
یار یہ شانہ تو ہے ہنسنے ہنسانے کی مشین

سید فہیم الدین

من کو تمہارے گیسو جب ناگ ہو گئے ہیں
یادیں سلگ اٹھی ہیں، تن آگ ہو گئے ہیں

محفل میں شیریں بن کر گرجے بہت ہیں لیکن
بیوی کے سامنے تو سب آگ ہو گئے ہیں

بیوی بھی گا رہی ہے اور گا رہے ہیں ہم بھی
دو راگنی بنی ہے ہم راگ ہو گئے ہیں

چوزہ سمجھ کے جن کو اگنور کر رہے تھے
تازہ ہوا میں آ کر سب گھاگ ہو گئے ہیں

وہ سب کہ جو سراسر تنقید پر تھی مبنی
وہ تبصرے تمہارے بے لاگ ہو گئے ہیں

بجتو ہوئی ہے شامل جو بخت میں ہمارے
یہ بھاگ بھی ہمارے کیا بھاگ ہو گئے ہیں

سید فہیم الدین

پیار میں ہو امتحاں کوئی کڑا تیرے لئے
ہم بھی اب لے آئے ہیں کچا گھڑا تیرے لئے

کوئی ہم جیسا فقط کنگال سا عاشق ترا
کوئی لے آیا ہے سونے کا کڑا تیرے لئے

اس قدر سوچا تجھے کہ سر میں جوئیں پڑ گئیں
گنج میں ہے مبتلا اب کھوپڑا تیرے لئے

عقد کرنا تھا سو ہم نے کر لیا اپنے تئیں
خود کو ہم رکھتے بھلا کب تک چھڑا تیرے لئے

تو نے جو دیکھا تھا وہ تو کب کا ماضی بن چکا
پھر کہاں سے لائیں گے وہ تھوبڑا تیرے لئے

تو بھی لے آیا ہے جو چہرہ بلا میک اپ یہاں
لے کے ہم بھی آ گئے پیزا سڑا تیرے لئے

خاورؔی

اگر تم چیک پہ تھوڑا سا لکھا تبدیل کر لیتے
تو ہم بھی پارٹی یہ اے ہمنوا تبدیل کر لیتے

بیماری کے بہانے پر ابھی یورپ کو ہو آتے
منسٹر ہوتے تو آب و ہوا تبدیل کر لیتے

کسی لیڈر کی طرح جھوٹ ہم کہتے تو پھر شاید
''مکاں اپنا وہی رکھتے پتہ تبدیل کر لیتے''

ہمیں اخبار اتنے چٹ پٹے معلوم نہ ہوتے
اگر اخبار نہ ہر واقعہ تبدیل کر لیتے

تمہارے بھائیوں کی فوج گر معلوم ہوتی تو
بہت پہلے ہم اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے

خاورؔی

لو کرارے دار سے اشعار کا دفتر کھلا
قہقہوں کا اب نظر آئے گا اک سنٹر کھلا

شب کو ٹی وی پر جو دیکھا پاپ کا سنگر کھلا
اس طرح اچھلا وہ کودا جس طرح بندر کھلا

تو سیاستدان ہے میں تجھ سے کیوں کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

''گو نہ پاؤں اس کی باتیں گو نہ سمجھوں اس کا بھید''
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے ایک تو افسر کھلا

ہے تو اس کو ہے فقط رشوت ستانی کا خیال
ایک لیڈر سے پڑا کچھ کام تو مجھ پر کھلا

محمد عارفؔ

اور ہیں جو کما کے کھاتے ہیں
مولوی تو دبا کے کھاتے ہیں

چار کھاتے ہیں ہاتھ منہ دھو کر
چھے پراٹھے نہا کے کھاتے ہیں

جب سے معدہ ہوا خراب اپنا
خوب ہم بھی چبا کے کھاتے ہیں

مار کھاتے ہیں اس کے ہاتھوں کی
روٹیاں خود بنا کے کھاتے ہیں

اپنا اپنا چکن مٹن ہو تو
دال ہو تو ملا کے کھاتے ہیں

پہلے پہلے چھپا کے کھاتے تھے
اب تو رشوت دکھا کے کھاتے ہیں

مہ جبینوں سے ان کمینوں سے
بچ! یہ الو بنا کے کھاتے ہیں

تنویرالدین احمد پھولؔ

ڈھلی ہیں اُن کی جُرابیں نہ جانے ورنہ کیا ہوتا
مہک جو سونگھ لیتا بس وہ کوے میں پڑا ہوتا

پڑوسن تیری چنچل ہے ، تجھے اُلو بناتی ہے
جو آتا اُس کا گھر والا ، کچن میں تو چھپا ہوتا

ہزاروں باتیں سُن کے بھی وہ گھس جاتا بلا کھٹکے
رقیبوں کی طرح وہ بھی اگر چکنا گھڑا ہوتا

نہ جانے حال کیا ہوتا تری اِس توند کا لیڈر !
سری پائے ، نہاری سے جو اِس کو بھر لیا ہوتا

دیا فتویٰ نہ مرضی کا ، پریشاں لوگ ہیں سارے
پھسلتے مولوی صاحب اگر حلوہ ملا ہوتا

پسند آتی ہے چرسی کو بہت پٹرول کی خوشبو
غٹا غٹ اس کو پی جاتا جو شربت کا مزا ہوتا

پھنسا تھا جال میں جب شیر، چوہے نے کتر ڈالا
نہ ہوتی دوستی ان میں، نہ گل کوئی کھلا ہوتا

وہ قسمت سے بچا اب تک وگرنہ یہ یقینی تھا
وہ چوہے دان میں پھنستا یا بلے کی غذا ہوتا

شرارت کی چمک ایسی تھی پھولؔ! اُن شوخ آنکھوں میں
خجل ہوتا یقیناً گر وہاں بلا کھڑا ہوتا

شوکت جمال

آ کر مری آنکھوں کو ذرا دیکھ ستمگر
ہیں تیری محبت میں ابھی خشک، ابھی تر

قاصد بھی ہے پیغام رسانی سے گریزاں
آنکھوں کو ہے طوطے کی طرح پھیرے کبوتر

بدلے میں وفا کے مجھے کیا دو گے بتادو!
یہ فیصلہ ہو جائے ابھی اور یہیں پر

پوچھا کہ عدو لینے کو آتا ہے بھلا کیا
منہ پھیر کے وہ غصے سے بولے کہ ”ترا سر“

میخانوں میں اعمال کی ہو کیوں نہ درستی
ناصح کو ملے قوتِ گویائی وہیں پر

ہم اُن کی گلی جان لٹانے کو جو پہنچے
بولے ”ہمیں بدنام نہ کر، اور کہیں مر“

تو کس لئے ٹالے ہے بھلا کل پہ مرا کام
گر قتل ہی کرنا ہے کر آج، ابھی کر

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

کیا ہے اُس نے یوں ایمان پختہ
کہ سالم کھا گیا وہ ران پختہ
جو اُس کے ہجر میں پیلے پڑے ہم
جگر میں ہو گیا یرقان پختہ
ہماری انتہائے آرزو ہے
ملے دو چمچ چینی، نان پختہ
کمر ٹوٹے گی اب تو عاشقوں کی
کہ اُس کے گھر کی ہے ڈھلوان پختہ
کہاں سے آئے وہ سوندھی سی خوشبو
ہوئے ہیں اُن کے سب دالان پختہ
ہوا ہے منہ مرا ”تھپڑ رسیدہ“
کیا ظالم نے یوں چالان پختہ
کھلا دے اب مجھے دم پخت دنبہ
کوئی تو ڈش ہو دلبر جان پختہ
پڑھائیں گے نہ اب بچوں کو اپنے
ارادہ ہے یہ ابا جان پختہ
ہمیں پختون سمجھے خان بھائی
غزل میں جب پڑھی گردان پختہ
کھلیں الفت کے کیسے پھول مظہرؔ
کہ ہیں سب اُس کے دل کے لان پختہ

میاں افتخار رشید

شوہر برائے فروخت

بازار میں ایک نئی دکان کھلی، جہاں شوہر فروخت کیے جاتے تھے۔ اس دکان کے کھلتے ہی لڑکیوں اور عورتوں کا اژدہام بازار کی طرف چل پڑا۔ سبھی دکان میں داخل ہونے کے لیے بے چین تھیں۔ دکان کے داخلہ پر ایک بورڈ رکھا تھا، جس پر لکھا تھا:''اس دکان میں کوئی بھی عورت یا لڑکی صرف ایک وقت ہی داخل ہو سکتی ہے'' پھر نیچے ہدایات دی گئی تھیں۔۔۔''اس دکان کی چھ منزلیں ہیں ہر منزل پر اس منزل کے شوہروں کے بارے میں لکھا ہوگا، جیسے جیسے منزل بڑھتی جائے گی شوہر کے اوصاف میں اضافہ ہوتا جائے گا خریدار لڑکی یا عورت کسی بھی منزل سے شوہر کا انتخاب کر سکتی ہے اور اگر اس منزل پر کوئی پسند نہ آئے تو اوپر کی منزل کو جا سکتی ہے۔ مگر ایک بار اوپر جانے کے بعد پھر سے نیچے نہیں آ سکتی سوائے باہر نکل جانے کے۔۔۔

ایک خوبصورت لڑکی کو سب سے پہلے دکان میں داخل ہونے کا موقع ملا، پہلی منزل کے دروازے پر لکھا تھا۔''اس منزل کے شوہر برسرروزگار ہیں اور اللہ والے ہیں۔''

لڑکی آگے بڑھ گئی۔ دوسری منزل کے دروازہ پر لکھا تھا۔''اس منزل کے شوہر برسرروزگار ہیں' اللہ والے ہیں اور بچوں کو پسند کرتے ہیں۔''

لڑکی پھر آگے بڑھ گئی۔ تیسری منزل کے دروازہ پر لکھا تھا۔''اس منزل کے شوہر برسرروزگار ہیں' اللہ والے ہیں بچوں کو پسند کرتے ہیں اور خوبصورت بھی ہیں۔''

یہ پڑھ کر لڑکی کچھ دیر کے لئے رک گئی مگر پھر یہ سوچ کر کہ چلو ایک منزل اور جا کر دیکھتے ہیں وہ اوپر چلی گئی۔ چوتھی منزل کے دروازہ پر لکھا تھا۔''اس منزل کے شوہر برسرروزگار ہیں' اللہ والے ہیں بچوں کو پسند کرتے ہیں' خوبصورت ہیں اور گھر کے کاموں میں مدد بھی کرتے ہیں۔''

یہ پڑھ کر اس کو غش سا آنے لگا' کیا ایسے بھی مرد ہیں دنیا میں؟ وہ سوچنے لگی کہ شوہر خرید لے اور گھر چلی جائے، مگر دل نہ مانا وہ ایک منزل اور اوپر چلی دی۔ وہاں دروازہ پر لکھا تھا۔''اس منزل کے شوہر برسرروزگار ہیں' اللہ والے ہیں بچوں کو پسند کرتے ہیں' بیحد خوبصورت ہیں' گھر کے کاموں میں مدد کرتے ہیں اور رومانٹک بھی ہیں۔''

اب اس عورت کے اوسان جواب دینے لگے۔۔ وہ خیال کرنے لگی کہ ایسے مرد سے بہتر بھلا اور کیا ہو سکتا ہے مگر اس کا دل پھر بھی نہ مانا وہ اگلی منزل پر چلی آئی۔ یہاں بورڈ پر لکھا تھا''آپ اس منزل پر آنے والی ؟؟؟ ویں خاتون ہیں۔۔ اس منزل پر کوئی بھی شوہر نہیں ہے۔۔ یہ منزل صرف اس لئے بنائی گئی ہے تا کہ اس بات کا ثبوت دیا جا سکے کہ ''عورت کو مطمئن کرنا ناممکن ہے'' ہمارے سٹور پر آنے کا شکریہ، سیڑھیاں باہر کی طرف جاتی ہیں۔

نادر خان سر گروہ

مرغے والی ۔۔۔ حویلی

میں ایک خواب لیے پھرتا رہا۔ ایک ایسے گھر کا خواب...... جس میں بس خواب ہی خواب دیکھا کروں۔ مگر شہر میں چھڑوں کو مکان حاصل کرنے میں کتنی دشواری ہوتی ہے یہ وہی جانتے ہیں جو خوش نصیبی سے کہیے یا بدقسمتی سے...... چھڑے کے چھڑے ہی ہیں۔ میں نے بھی کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا......، کس کس کی منتیں نہیں کی۔ اپنے دوست پُر جوش پوری کے بھی رُوکھے سُوکھے ناز اٹھائے۔ آخر تلاش بسیار کے بعد میری مایوسی...... جب پستی کو پہنچ گئی اور میں مکان کی تلاش دوسرے جہان میں منتقل کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ایک روز انہوں نے خوش خبری سنائی، ''خان! ایک خالی مکان کا پتا چلا ہے۔ تمہاری جیب اور کھوپڑی کی طرح بالکل خالی۔ کل صبح خلافِ عادت اُٹھ کر دیکھنے جانا ہے۔ منہ دھو کر آنا۔''

دوسرے دن، علی الصباح دفتر جانے سے قبل میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ چوں کہ معمول سے پہلے اُٹھنا پڑا تھا۔ نیند کا خمار اَبھی پوری طرح اُترا نہ تھا۔ بلکہ یہی وہ وقت تھا جب میں اپنی نیند کو صحیح معنوں میں تڑکا لگاتا تھا۔ خیر...... جھومتے جھامتے، بگیماران جیسی پیچیدہ گلیوں سے (جو میں نے اب تک دیکھی ہی نہیں) ہوتے ہوئے ہم ایک...... دو منزلہ عمارت کے پاس آ کر رُکے۔ عمارت کیا تھی؟ تار تار...... یعنی'' حویلی تھی۔ پُر جوش نے ڈور بیل کا بٹن دبایا...... اندر سے مرغے کی بانگ سنائی دی۔ وہ چونک کر بولے ''عجیب ڈور بیل ہے، کہیں یہ پُر اسرار حویلی تو نہیں؟''...... دوبارہ، بڑی احتیاط سے اِس انداز میں بٹن دبایا جیسے بجلی کے کرنٹ کا خدشہ ہو۔ اب کی بار ڈور بیل ہی بجی۔ دراصل حویلی کے احاطے میں موجود مرغا قدرتی نظام سے بانگ دے رہا تھا، بانگِ جرس، یعنی ڈور بیل سے اُس کا کوئی کنکیشن نہیں تھا۔ شہر کی فضا میں صبح صبح اُس کی بانگ بھلی معلوم ہوئی۔ ابھی میں نے مکان دیکھا بھی نہیں تھا مگر مرغے کی بانگ سے متاثر ہو کر یہیں بس جانے کا ارادہ کر لیا، اِس خیال سے کہ گھڑی کے آلارم کو بند کر کے مزید دو...... دو منٹ سونے کی بری عادت سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہاں مرغے کا ٹینٹوا پہنچ سے اِتنی دُور ہوگا کہ اُسے دبا کر بند بھی نہ کر سکوں گا۔

خیر...... بار بار ڈور بیل بجانے اور مرغے کی بانگ بجنے کے بعد قفل کھلا۔ ایک لمبا تڑنگا، چوڑا چکلا شخص اِس طرح سامنے کھڑا نظر آیا، گویا دروازہ کھول کر دیوار کھڑی کر دی گئی ہو۔ شکل کو حتی الامکان خوفناک بنانے کے لیے، بڑی بڑی مونچھوں، زخموں کے نشانات، مسّوں اور موٹے موٹے تِلوں سے اِتنا بھر دیا گیا تھا کہ ایک چھوٹا سا بھی تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ ابھی اُس نے جمائی لینے کو منہ کھولا ہی تھا کہ مرغے نے بانگ دی۔ مَیں اُس کی ٹائمنگ کی داد دِیے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر کچھ دیر پہلے بانگ نہ سنی

ہوتی تو یہی سمجھتا کہ اسی دروازہ اور منہ کھولنے والے شخص کے نرخرے سے ہی نکلی ہے۔ اُس نے سر کھجانے کے بعد پُر جوش پوری سے ہاتھ ملایا اور جب میری باری آئی تو دوبارہ سر کھجانے لگا۔ پُوری نے میرا ہاتھ فضا میں معلق دیکھ کر کہا ''اپنا ہاتھ دیجیے۔''

''کیا ہاتھ مانگنے آئے ہیں؟'' وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''علاقے کے بدمعاش اور ایسی حسِ مزاح؟...... ہمیں پتا چلا ہے کہ آپ کی حویلی سے ملحق مکان خالی ہے۔'' (آدھا جملہ مَیں نے دل میں کہا)

وہ بولا...... ''تو؟''

''میں لینا چاہتا ہوں وہ مکان۔''

پیچھے اچانک شور اُٹھا۔ کچھ مرغیوں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس پھڑ پھڑاہٹ کے بیچ ایک نسوانی آواز اُبھری۔ ''بھائی! ...... اِن مرغیوں کے لیے ایک نیا دڑبہ تو بنوا دیں، اِس چھوٹے سے دڑبے میں کتنی مرغیاں رہ سکیں گی؟'' میری نظر اُس طرف اٹھی تو...... اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی۔ مرغیوں سے اِس درجہ محبت، تو انسانوں سے کتنی ہوگی۔ پُوری نے کھنکارتے ہوئے میری توجہ اپنی طرف مبذول کی، میں نے اُن کی شرارت بھری مسکراہٹ میں پڑھا: ''کاش تم یہاں ہاتھ مانگنے آئے ہوتے۔''

میری شرافت بھری نظروں نے اُنھیں جواب دیا: ''سرِدست ایک دڑبہ ہی ہاتھ لگے تو بہت ہے۔''

آخر فقرے بازی، جملہ (نا) سازی کے بعد تمام معاملات طے پائے۔ اگلے دن میں اپنا ساز و سامان لے کر وہاں منتقل ہوا۔ اُس روز مرغیوں نے بہت شور مچایا، گویا جشن منا رہی ہوں۔ جس کے مضمون کا عنوان ہو...... ''اور آنا گھر میں سر گروہ کا''، لیکن عجیب بات دیکھی، اُس روز مرغے نے خوب بانگ دی۔ یوں مجھے لگا کہ اُس کا ''بانگ پن'' شباب پر تھا۔ میں سامان شفٹ کر کے بہت تھک گیا تھا، پتا نہیں کب آنکھ لگ گئی، بلکہ لگ لگ کے کھلتی رہی۔ مرغا تھا کہ ہر تھوڑی دیر بعد صبح صادق کا احساس دلاتا اور خود ہی کاذب ثابت ہوتا۔ اب تو مجھے مرغے کی ''بانگی'' حالت پر شبہ ہونے لگا۔ میں نے پُر جوش پُوری کو طلب کر

کے شکایت کی ''بانگ ہے یا مرغ کی ایک ٹانگ؟ میں نے مرغے دیکھے تو بہت ہیں، مگر اِتنا تُنسا کسی کو نہیں۔''

بولے ''یہ سمجھو کہ یہ 'نادر' مرغا ہے۔ میاں! شکر کرو کہ ایئر پورٹ یا ریلوے ٹریک کے قریب نہیں رہنا پڑ رہا ہے۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے، گزارا کر لو! بہت جلد تم بھی میری طرح اپنا کنوارا پن تج کر کسی کے ہو گے اور کہیں تو رہ لو گے۔

چند روز اسی طرح گزرے، میری نیند اُچٹ گئی، وہ تو شکر تھا کہ دفتر میں آرام دہ کرسی میسر تھی۔ مگر گھر کی نیند جیسی بات اور کہاں؟ جب نیند کا قرض مجھ پر اتنا چڑھا کہ برداشت نہ ہو سکا، تو ایک صبح دفتر جانے سے قبل اپنے چہرے پر بے خوابی کا ثبوت لیے مرغے کے مالک کے حضور جا پہنچا ''آپ کے مرغے نے کان میں دم کر رکھا ہے۔'' کہنے لگا کہ کیا کِیا جائے۔ میں نے کہا کہ کوئی حل تلاش کیجیے۔ جواب ملا ''تم ہی بتاؤ! ہمارے لیے یہ مسئلہ ہوتو حل تلاش کریں۔'' میں نے جھٹ حل بتایا ''کاٹ کھائیے۔'' بولا ''یہ ہم سے نہ ہونے کا۔'' میں نے گلہ کِیا..... ''ہماری کتنی محال ہے۔ آپ کی نظر میں انسان کے مقابلے میں مرغے کی اہمیت زیادہ ہے۔ مجھے انسان نہ سہی کرایہ دار سمجھیے جو مہینے کے مہینے آپ کو کرایہ دے گا۔'' اُس نے اپنے مالکانہ حقوق استعمال کرتے ہوئے بے رحمی سے میرا 'گلا' گھونٹا ''تم جیسے بہت مل جائیں گے، اِس جیسا دوسرا نہیں ملے گا۔'' میں ذرا سا جواب سن کر، اپنا سا منہ لیے لوٹ آیا۔

ایک ویک اینڈ پر پُوری کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے میں نے مرغے کے تئیں ایک چال سوچی ''سوچتا ہوں کہ اگر مجھے گھوڑے بیچ کر سونا ہے تو مرغے کو خرید کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سُلا دینا ہوگا، اِس بہانے آپ کی دعوت بھی ہو جائے گی۔ اُن کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ کہنے لگے ''شوق سے خریدو! مرغے میں بڑی جان ہے، مزہ آجائے گا، مگر اُسے کھا کر کہیں تم بھی اُسی کی طرح بانگ دینے نہ لگ جاؤ۔''

دو تین روز بعد جب میری پچھلی شکایت کا اثر ماند پڑ گیا تو میں نے مُچھندر سے مرغا خریدنے کی بات اِس انداز میں کہی

جیسے کوئی بے روزگار نوجوان، امیر باپ سے بیٹی کا رشتہ مانگتا ہے۔ اُس نے مجھ سے یہ پوچھے بغیر کہ کتنا کما لیتے ہو...... مرغے کی اِتنی قیمت بتائی کہ میرے طوطے اُڑ گئے۔ ایک تو مرغا بگڑا ہوا یعنی...... 'آؤٹ آف آرڈر' اور اُس کی اِتنی قیمت!! شاید اُس نے بھی میری طرح بزرگوں سے یہ نصیحت سن رکھی ہو کہ جس چیز کے بیچنے کا اِرادہ نہ ہو تو...... طلب گار کے سامنے سیدھے سیدھے انکار مت کرو۔ اُس کی اوقات سے بڑھ کر قیمت بتاؤ کہ وہ خریدنے کا خیال دل سے نکال دے۔ اِس طرح آرزومند کی نیت اُس چیز میں اٹکی نہیں رہے گی۔ چنانچہ اِس مرتبہ بھی مَیں یہ سوچتے ہوئے خالی ہاتھ لوٹ آیا کہ مرغا پالنے کا کوئی مقصد تو سمجھ میں آئے؟...... مرغی تو خیر انڈے دیتی ہے، سیتی ہے، بچے پال 'کوس' کر بڑے کرتی ہے۔ مگر یہ مرغا...... ایک بانگ بھی ٹھیک سے نہ دے سکے تو بھلا کس کام کا؟

مرغے کی بانگ اور میری نفرت، دونوں ساتھ ساتھ پَروان چڑھ رہے تھے کہ مجھ میں اِتنی ہمت جانے کہاں سے آگئی کہ ایک رات چپکے سے حویلی میں داخل ہوا اور اُسے دبوچ لیا۔ سب سے مشکل کام تھا اُس مرغِ نوگرفتار کو مِیُوٹ کرنا۔ بڑی مشکل سے کبھی چونچ تو کبھی گلا دَبا کر اُسے اپنی حدود میں لے آیا اور اِس سے پہلے کہ وہ اپنے محلِ وقوع کا پتا دے، اُس کی بانگ کا کنیکشن کاٹ دیا۔ پھر اطمینان کا سانس لے کر اُس کے باقیات کو چولہے پر چڑھایا اور گلِ نوخیز اختر کی کتاب ''ٹائیں ٹائیں فِش'' پڑھتے ہوئے ''چکن اِسکریم سُوپ کا 'بے خبری' سے انتظار کرنے لگا۔ ابھی چند صفحات ہی پڑھے تھے کہ اچانک مرغے کی بانگ سے کتاب میرے ہاتھوں سے غائب ہوگئی، یعنی میری آنکھ کھل گئی۔ ناہنجار خواب بھی مکمل کرنے نہیں دیتا۔ کاش! تمام عمر خواب کا سلسلہ نہ ٹوٹتا۔ مَیں سب کتے، بِلّوں، اژدھوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔

دن گزرے اور راتیں گزاری گئیں...... اِس دوران حد سے زیادہ صبحیں مرغے کی وجہ سے آئیں۔ ایسی ہی ایک صبح پُرجوش پوری نے زِچ ہو کر مشورہ دیا کہ تم بھی مرغے کی طرح اُس گھر سے رشتہ جوڑ لو۔'' میں نے کہا ''اِس طرح تو وہ مرغا میرے اور بھی قریب ہو جائے گا۔''

بولے ''جب مرغے والی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہوگا تو تم مرغے کو جب چاہے 'جلا بطن' کر سکو گے۔''

''اگر وہ بے تالا...... بھائی سے زیادہ بہن کو عزیز ہو تو؟...... دڑبے میں رہ کر مرغے سے بَیر! کتنا دشوار ہوگا، ذرا سوچو تو!'' میں نے مخفی خطرے (ہِڈن رِسک) کا اندیشہ ظاہر کیا، مگر اُن کے مشورے کو یکسر رَد بھی نہیں کیا اور اَپنے خوابوں کی فہرست میں ایک اور خواب کا اضافہ کر لیا۔

وہ اتوار کی شام تھی...... (شام میرے لیے تھی) ابھی دونوں وقت ملے نہیں تھے۔ اچانک مرغے کی بانگ مجھے بالکل قریب سنائی دینے لگی۔ باہر نکل کر دیکھا تو وہ برآمدے میں ہَوا خوری کرتا نظر آیا اور وہی لڑکی دیوار پر بیٹھی، مُرغے کو ہاتھ کے اشارے سے ''دڑبے دڑبے...... دڑبے دڑبے'' کہتے ہوئے اپنی طرف بُلا رہی تھی۔ اُس کا سراپا بالکل ویسا ہی تھا، جیسا ہر رومانی افسانے میں ہوتا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے ڈھلکا ہوا آنچل سمیٹا اور بکھری ہوئی لٹوں کو جھٹکاتے ہوئے مجھ بیمار کو حکم دیا ''اے مِسٹر! ذرا مرغا تو پکڑا دووو۔''

''اب میں اِس کام کے لیے رہ گیا ہوں؟''

''اوہووو! تو جناب کا کام خونخوار جانور پکڑنا ہے؟ اگر کوئی

ترجمہ

ایک بار صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے ریڈیو اسٹیشن آ کر بتایا کہ اُن کے ہاں پوتا پیدا ہوا ہے۔

حمید اعظمی نے پوچھا ''پوتے کا نام کیا رکھا ہے؟''

''اسماعیل''۔۔۔صوفی صاحب نے بتایا۔

''اچھا تو گویا اُنہوں نے اپنے ہی نام کا انگریزی ترجمہ کر دیا ہے، آپ کا نام تبسم ہے اور آپ کا پوتا اسمائل SMILE ہے۔''

صوفی صاحب بہت محظوظ ہوئے۔

یہ لاہور ہے از ابوالحسن نغمی

فہرست بنا رکھی ہو تو بتا دو، تاکہ آئندہ خیال رکھا جائے۔ پکڑتے ہو یا...... چھوڑوں چُوزے ے ے؟''

''کیا ہوگا اُن چوزوں سے......؟''

کیا ہوگا!!!؟...... چوزوں کے پیچھے اُن کی ماں دوڑی آئے گی اور وہ حال کردے گی کہ محلّہ چھوڑ کر بھاگو گے ے ے۔''

''میں پہلے ہی مرغے سے پریشان ہوں۔ اور اب یہ مرغی!......''

وہ میرے شکوے کو سُنا اَن سنا کرتے ہوئے بولی ''تم سے پہلے جو کرایہ دار تھا وہ...... یوں چٹکی میں پکڑ لیتا تھا!!!۔ لمبا تڑنگا، یہ بڑی بڑی مونچھیں۔ تم تو میری طرح ہی ہو...... ایک دم کلین شیو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ پکڑ لو گے یہ مرغا، مونچھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا!!!۔''

اُس نے ایسی غیرت دلائی کہ میں نے آستین چڑھائی، پائنچے موڑے اور وکٹ کیپر کا پوز بنا کر لگائی دوڑ مرغے کے پیچھے۔ پھر نہ پوچھو، کیا کیا نہ ہوا۔ دیوار سے سر ٹکرایا تو کبھی سَر سے دیوار ٹکرائی، زمیں پر آسماں نظر آیا، آسمان پر زمیں نظر آئی۔ کبھی مرغا ٹانگوں کے بیچ سے تو کبھی سر کے اوپر سے اُڑ کر نکل جائے۔ غرضیکہ برآمدے میں پڑی ایک ایک فضول شے ہاتھ لگی، مگر مرغا ہاتھ نہ آیا۔ عجب تماشہ بنایا اُس نابکار نے۔ یہاں مرغا نہ رکتا تھا، وہاں اُس اکیلی تماش بین کی ہنسی نہیں رکتی تھی۔ آخر پسینہ پونچھتے ہوئے میں اُس سے مخاطب ہوا کہ اِس بہانے ذرا دم لے سکوں ''تم نے اپنے مرغے کو آداب نہیں سکھائے۔ ایسا سلوک کرتے ہیں پڑوسیوں کے ساتھ؟'' مجھے ہانپتا دیکھ کر وہ مرغے والی ...... چھلانگ لگا کر میرے آنگن میں چاندنی کی طرح اُتر آئی۔ اِس غیر متوقع چھلانگ پر میں چونک گیا ''ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو؟ لوگ کیا کہیں گے۔ بولی ''کیا کہیں گے؟...... میرا!!! گھر ہے ے۔'' یہ جملہ کانوں کو اِتنا بھلا معلوم ہوا کہ میں اپنے ذہن کے اسٹور رُوم میں محفوظ پُر جوش پوری کے مشورے کو یاد کر کے خیالوں میں کھو گیا۔ اُس نے چیخ کر اوقات یاد دلائی ...... ''کرایہ دار ہو، خرید تو نہیں لیا اِس گھر کو وو۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے ڈھائی قدم دوڑ کر یعنی شطرنج کے گھوڑے کی چال چل کر بڑی آسانی سے مرغے کو دبوچ لیا اور دیوار پر جا بیٹھی۔ دونوں ٹانگوں کو ہلاتے ہوئے، بکھری ہوئی لٹوں کو اِس طرح جھٹکایا کہ وہ دو چار نئی لٹوں کے ساتھ لوٹ کر پھر اُس کے رُخ پر لہرانے لگی۔ بولی ''دیکھا، کیسے پکڑا!!!............ ایک چٹکی میں ں ں۔''

''بہت خوب! بڑی چالاک نکلیں...... پہلے میری توانائی سے مرغے کو خوب دوڑا دوڑا کر تھکا دیا اور فلمی پولیس کی طرح آخر میں آ کر میدان مار لیا۔''

''اچھا!!!!...... ایسی بات ہے تو پھر کسی روز دیکھیں گے ے ے۔'' وہ دیوار پھاند کر دوسری طرف نظر سے اوجھل ہو گئی اور اُس کا دوپٹہ رینگتا ہوا اُس کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اُس کے برآمدے کے اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا...... دونوں وقت مِل رہے تھے۔

اُس روز دَم پھولنے اور خفت اٹھانے کے باوجود مجھے چوڑیوں کی کھنک اور آواز کے جلترنگ میں مرغے کی بانگ اُتنی بری نہیں محسوس ہوئی۔ اُس کے بعد میں نے چاہا کہ مرغا میرے پالے میں دوبارہ آئے، لیکن، جانے کیوں، وہ اِس طرف پھر نہ آیا۔ شاید وہ اِس بات کا قائل ہو کہ اُسے جلدی پکڑا جائے، ناتجربہ کار بندہ خوامخواہ دوڑا دوڑا کر تھکا دیتا ہے۔

اُس ''ہَنسین'' واقعے کے بعد مَیں نے آہستہ آہستہ مرغے کی بانگ کے ساتھ جینے کی عادت ڈال لی۔ اب مجھے کم از کم راتوں کو نیند آنے لگی۔ مَیں نے ترکیب یہ نکالی کہ مرغے کی جملہ بانگوں میں سے ایک بانگ کا انتخاب صبح اٹھنے کے لیے کر لیا۔ لیکن عالمِ بیداری میں اکثر فون پر گفتگو کے وقت یا گھر آ دھمکنے والے بکواسی دوستوں سے باتوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کے دوران مرغے کی بانگ سے...... کبھی 'کوما' تو کبھی 'فل اِسٹاپ' لگ جاتا۔

زندگی چین سے گزر رہی تھی کہ ایک روز دفتر سے لوٹا تو عجب دل دہلانے والا منظر دیکھا۔ دروازہ کھلا پڑا ہے، اندر ہر چیز اُلٹ پلٹ۔ صندوق، الماری ہر چیز خالی اور اُن کے اندر بکھرے

ہوئے مشمولات اب زمین پر بکھرے ہوئے ہیں۔ باورچی خانے میں پتیلیاں کھلیں، ریفریجریٹر کھلا۔ ابھی میں کچھ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ وہی مچھندر...... چارمسٹنڈوں کے ساتھ میرے مکان میں داخل ہوا اور میرا گریبان پکڑ کر اس طرح اوپر اٹھالیا کہ پیروں تلے زمین نکل گئی۔ پوچھا، ''مرغا کہاں ہے؟'' اُس کے پتھرے کی نوک میری گردن پر تھی۔ میں نے التماس کیا، ''ذرا مجھے نیچے اتارو اور یہ چھرا دُور رکھو تو کچھ بتاؤں۔'' زمین پر پاؤں پڑتے ہی میں نے کہا ''وہ بھی کوئی چھپنے کی چیز ہے؟ جہاں ہوگا...... اپنی موجودگی کا پتا دے گا۔''

''تمہارے پیٹ میں ہوگا تب بھی؟'' اُس نے پتھرے کی نوک میرے پیٹ میں چبھوئی۔

''اگر پیٹ میں ہوتا اب کوئی کیا کرسکتا ہے؟ تمھیں شکر کرنا چاہیے کہ اب ہمارے کانوں اور اُس کے گلے کو آرام ملا ہے۔''

اُس نے گرج کر مجھے زمین پر گراتے ہوئے وارننگ دی ''ایک گھنٹے کے اندر اندر کہیں سے بھی میرا مرغا نکال کر دو۔ ورنہ ....''

میں نے التجا کی کہ اتنے کم وقت میں بازیابی ممکن نہیں، اُس کی برآمدگی کے لیے مجھے کل صبح تک کا وقت دیا جائے۔ اُس نے میری طرف تند نظر سے دیکھتے ہوئے کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور کہا ''صحیح سلامت! ...... ویسی ہی بلند بانگ کے ساتھ! اگر صبح تک مجھ سے انتظار نہیں ہونے کا، میرے سونے سے پہلے پہلے مرغا میرے کان کے سامنے ہونا چاہیے، ورنہ......'' اپنی دھمکی کے آخر میں وہ ابہام اور کئی معانی چھوڑ کر چل دیا اور گرگے بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیے۔ میں زیرِ لب بڑبڑایا ''اب یہ بکھرا ہوا سامان کون ترتیب دے گا؟'' تڑاک سے جواب ملا ''بھائی کے نوکر ہیں...... بیٹنگن کے نہیں۔''

میں نے گھبراہٹ کے عالم میں پر جوش پوری کو بلالیا اور پورا ماجرا دکھانے، سنانے کے بعد راتوں رات مکان چھوڑنے کی بات کہی۔ انہوں نے ایک شرط پر وقتی طور پر ایک دوست کے ہاں رکھنے پر حامی بھری کہ میں اُسے اپنے مضامین سے اقتباسات پڑھ کر نہیں سناؤں گا۔ اُس روز تک کا جتنا کرایہ بنتا تھا، انہیں تھا کر اگلے روز وہاں سے چھو ہوگیا۔ دو تین روز بعد جب وہ کرایہ ادا کرنے گئے تو انہوں نے مرغے کو حویلی میں جیتا 'جگاتا' دیکھا۔ بقول اُن کے، وہ اپنے زندہ ہونے کا بہ بانگ دُہل اعلان کر رہا تھا۔ دراصل وہ اگلی صبح، علاقہ غیر میں بانگ دیتا نکلا اور پکڑا گیا۔ اُس مچھندر نے، بجائے معذرت کرنے کے، یہ کہا کہ اچھا ہوا جو آپ کے دوست راتوں رات مکان سے چلے گئے، ورنہ جان سے جاتے۔

نئی جگہ پر مجھے سناٹا بہت کھلنے لگا۔ اندر اُداسی، باہر خاموشی۔ کئی راتیں میں سو نہ سکا، ایسے لگا کہ کسی چیز کی کمی سی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ماضی کے سب منظر گھومنے لگے۔ وہ نایاب مرغا، وہ مرغے والی...... حویلی۔ میں نے یک لخت فیصلہ کیا اور پوری کو کچھ بتائے بغیر اُسی سمت چل پڑا۔ کچھ دیر بعد میں پہاڑ جیسے مچھندر کے سامنے اونٹ کی طرح کھڑا تھا، مونچھوں کے گھنے جنگل میں چھپی اُس کی مسکراہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے سیدھے مطلب پر آیا ''میں...... وہ...... مکان...... دوبارہ کرایے پر لینا چاہتا ہوں۔''

اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا ''وہ تو کرایے پر اُٹھ چکا۔ تم سے پہلے جو کرایہ دار چھوڑ گیا تھا، اُسی نے دوبارہ لے لیا''

کتنے؟

ہری چند اختر جوش صاحب سے ملنے گئے، جاتے ہی پوچھا، ''جناب! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟''

جوش صاحب نے فرمایا، ''آپ تو غلط اردو بولتے ہیں، یہ آپ نے کیسے کہا کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں، جب کہ میرا تو ایک مزاج ہے نا کہ بہت سے مزاج۔''

کچھ دن بعد اختر کی پھر جوش سے ملاقات ہوئی۔ جوش نے فرمایا، ''ابھی ابھی جگن ناتھ آزاد صاحب کے والد تشریف لائے تھے۔''

اس پر اختر صاحب نے فرمایا، ''کتنے؟''

تقریبِ رونمائی

کتاب چھپ گئی چھ رنگے ٹائٹل کے ساتھ
طباعت اور کتابت کا بھی جواب نہیں

یہ رنگ اور یہ نوے گرام کا پیپر
ادب کے باب میں ایسی کوئی کتاب نہیں

سجی تھی بزمِ پذیرائی ایک ہوٹل میں
جہاں گلاب سے چہرے تو تھے گلاب نہیں

کسی وزیر نے اس بزم کی صدارت کی
یہ بات مجھ کو بتانے سے اجتناب نہیں

خوشا کہ بزم میں حاضر تھے ریڈیو، ٹی وی
نظامِ گردشِ دوراں ترا جواب نہیں

مقررین میں شامل تھے سب ہی دانشور
وہ ہستیاں تھیں جنہیں دیکھنے کی تاب نہیں

یہ کہہ کے غالب و مومن کا دے دیا درجہ
ادب میں ایسا کوئی اور آفتاب نہیں

مگر کتاب کی تقریبِ رونمائی میں
کتاب چیخ رہی تھی کہ میں کتاب نہیں

خالد عرفان

عالیؔ جی کی گمشدہ بیاض

جناب جمیل الدین عالیؔ جب مشاعرے میں شرکت کے لئے امریکہ تشریف لائے تو شعر سنانے سے قبل کسی منچلے نے ان کی بیاض چوری کر لی۔ جو مشاعرے کے بعد بھی نہیں ملی۔ اس بیاض کی گمشدگی پر ہمیں بے حد افسوس ہے۔ یہ نظم اسی دکھ کا اظہار ہے۔

بیاض چوری ہوئی ہے جنابِ عالیؔ کی
بیاض چور نے چوری بڑی مثالی کی

ضرور چور کوئی سارقِ ادب ہو گا
اسے بیاض چرانے کا خاص ڈھب ہو گا

میں ایسے چور کی دانش وری پہ ہوں حیران
جو ایک رات میں بن بیٹھا صاحبِ دیوان

جنابِ عالی کے کالم تھے جتنے مطبوعہ
سمجھ کے چھوڑ گیا ان کو نثرِ ممنوعہ

عجیب چور تھا نثری کلام چھوڑ گیا
بیاض لے گیا کالم تمام چھوڑ گیا

غزل کے ساتھ گئی مثنوی بھی، دوہا بھی
تمام شہر نے مانا تھا جس کا لوہا بھی

چھپا ہوا تھا جو شاعر نکل رہا ہوگا
وہ اس بیاض کے مقطعے بدل رہا ہوگا

جنابِ عالیؔ کی فکرِ جمیل تھی یہ بیاض
سخن وری میں بڑی خود کفیل تھی یہ بیاض

جس انجمن میں یہ جاتی تھی حشر کرتی تھی
ادب کے ساتھ سیاست بھی نشر کرتی تھی

محاذِ شعر پہ یہ بے نیام آتی تھی
یہی بیاض مصیبت میں کام آتی تھی

اسی بیاض سے دوہوں کو آزمانا تھا
''وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا''

خالدؔ عرفان

کرائے کا مکان

خالد عرفان

تمام عمر کرائے کے گھر میں رہتا ہے
کرائے دار ہمیشہ سفر میں رہتا ہے

مکاں کے ساتھ اگر واپڈا بھی جبر کرے
کرائے دار کو یہ چاہئے کہ صبر کرے

اور اتفاق سے شاعر ہو گر کرائے دار
تو ساری عمر کرائے کے گھر میں رہتا ہے

یہاں پہ زورِ گلو آزما نہیں سکتے
اگر ہے گانے کی عادت تو گا نہیں سکتے

کرائے کا یہ مکاں بھی عجیب خانہ ہے
ہم ایسے شاہ دلوں کا غریب خانہ ہے

مشاعرے میں کبھی واپسی پہ رات گئے
درِ مکان پہ ہم کھٹکھٹا نہیں سکتے

کہیں پہ کھڑکی نہیں ہے کہیں پہ چھت ہی نہیں
یہ وہ مکان ہے جس میں مکانیت ہی نہیں

چراغ جتنے جلاؤ یہ کوئی شرط نہیں
بس ایک بلب اضافی جلا نہیں سکتے

یہاں خلاء میں معلق جو ایک زینہ ہے
کہ اس مکان میں جینا بھی کوئی زینہ ہے

یہاں پہ نل کے ٹپکنے کا اب یہ مطلب ہے
نچوڑ سکتے ہیں لیکن نہا نہیں سکتے

کچھ اس طرح مرے اہل و عیال رہتے ہیں
کہ ایک روم میں دس نونہال رہتے ہیں

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس فلیٹ میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

سردیوں کا موسم ہے

دور دور مت جاؤ سردیوں کا موسم ہے
پاس پاس آ جاؤ سردیوں کا موسم ہے

ٹھنڈ سے نہ شرماؤ سردیوں کا موسم ہے
کانپتے چلے جاؤ سردیوں کا موسم ہے

لگ رہا ہے یوں مجھ کو بحرِ منجمد ہوں میں
خطِ استوا لاؤ سردیوں کا موسم ہے

منجمد نہ ہو جاؤ انتظارِ جاناں میں
عاشقی نہ فرماؤ سردیوں کا موسم ہے

ہو سکے اگر جاناں تم انگیٹھیاں لے کر
خواب میں چلے آؤ سردیوں کا موسم ہے

چائے تم پیو لیکن بس یہی گزارش ہے
آئس کریم مت کھاؤ سردیوں کا موسم ہے

برف رات ہے یارو یہ مشاعرہ کیسا
جاؤ اپنے گھر جاؤ سردیوں کا موسم ہے

برف بن گئیں غزلیں لفظ جم گئے شانہ
شاعری نہ فرماؤ سردیوں کا موسم ہے

اقبال شانہ

الف جو یہاں پر گرایا گیا ہے
روا تھا مگر نا روا لگ رہا ہے
جو بھرتی کے الفاظ سے شعر کو بھر دیا ہے
بہت بے تکا پن دکھایا گیا ہے
بھلا اس کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی
(کہ بھرتی سے تو لاکھ بہتر تھا اشعار لفظوں سے خالی ہی رہتے)

وہ مضمون جو دوسرے شعر میں آ گیا تھا اسے
پانچویں شعر کی دوسری سطر میں پھر گھسایا گیا ہے
یہ اک شاعرانہ رویہ نہیں
جبر ہے

مضامین میں خاص ندرت نہیں ہے
مصارع میں کوئی ذرا سا عروضی تناؤ نہیں
ڈھیلے ڈھیلے سے مصرعوں میں کمزور سی بات باندھی گئی ہے
کہیں پر تاثر کی وحدت نہیں ہے
غزل کا مربہ بنایا گیا ہے

مگر، خیر، پھر بھی یہ اک خوب صورت
روایت کی مٹی میں گوندھی ہوئی
اور نئے لہجے کی
اچھی خاصی غزل ہے

سید افتخار حیدر

آداب عرض

جی ہاں۔۔

میرے سرتاج!

مجھے تم سے کچھ کہنا ہے

بہت کچھ۔۔

ڈھیروں باتیں، اَن گنت گلے شکوے

پر تمہارے پاس میرے لیے وقت کہاں ہے؟

یہ سب سننے کے لیے۔۔

تمہاری زندگی تو وقت کی قید میں ہے

عرض کیا ہے۔۔

وہی صبح ہے وہی شام ہے

تمہاری زندگی کتنی عام ہے

آفس تک جانے کی دوڑ ہے

اور تم پر باس کی پھٹکار ہے

چلو۔۔ میں انتظار کیے لیتی ہوں

ملتے ہیں اگلے ماہ۔۔

اِک لمبی فہرست کے ساتھ

جواب عرض

ہاں ہاں۔۔

میری زوجہ محترمہ!

مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے

بے شمار باتیں، نصیحتیں اور فضیحتیں

تمہارے پاس تو وقت ہی وقت ہے نا!

یہ سب سننے کے لیے۔۔

میرا وہ کھڑوس باس۔۔ چھوڑو اس کا کیا کہنا ہے

کچھ اپنی کہو کچھ میری سنو

جواب عرض کیا ہے۔۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا

کبھی زمیں تو کبھی آسماں نہیں ملتا

کبھی جراب تو کبھی رومال نہیں ملتا

آج کل تمہارا مزاج بھی نہیں ملتا

چلو خیر۔۔ جو ہوتا ہے وہ ہونے دو

اپنی فہرست کو لمبا ہونے دو۔۔

تو ملتے ہیں اگلے ماہ شکایتی ٹرانسمیشن کے ساتھ

کائنات بشیر (جرمنی)

بچپن / پچپن کی محبت

بچپن کی محبت کو دِل سے نہ جُدا کرنا
پچپن کے افیئر میں تبدیل ذرا کرنا

نہ دانت بچے منہ میں نہ آنت بدن میں ہے
میٹھی سی لگن پھر بھی اس منچلے من میں ہے
اِس جذبِ وفا کو مت ٹھینگے پہ دھرا کرنا

مانا کہ اب آنکھوں سے کم کم نظر آتا ہے
پیغام نگاہوں کا ہر دم نظر آتا ہے
درشن سے درخشندہ جیون کو سدا کرنا

تم پوتوں کو ٹہلانے جب پارک میں آؤ گی
ہم کو بھی نواسوں میں واں کھیلتا پاؤ گی
ہر شام اِسی حیلے فدوی سے ملا کرنا

چھتیس برس پہلے تھے جو وہی تیور ہیں
بے درد زمانہ ہے پھر پیار کے رستے میں
اب کے نہ کرے گڑ بڑ کچھ ایسی دوا کرنا

سانڈوں سے ترے دونوں بیٹے ہیں تو پھر کیا ہے
اور بھانڈ مرے ہوتے سوتے ہیں تو پھر کیا ہے
ہر اِک سے ٹکر جانا ہر اک سے لڑا کرنا

آ عہد کریں کہ ہر زنجیر کو توڑیں گے
اب ہاتھ جو تھامیں گے تاعمر نہ چھوڑیں گے
اچھا نہیں جیون کا ہر مِیچ ڈرا کرنا

نوید ظفر کیانی

ڈاکٹر کی شادی

شہر کے اِک سرجن کے من میں بات انوکھی آئی
اُس نے اپنی شادی کی ہر رسم عجب کروائی

چہرے پر میک اپ کے بدلے ''بٹنو ویٹ'' لگائی
ہاتھوں پر مہندی کے بدلے ''پایوڈین'' رچائی

پگڑی کی جا اپنے سر پر باندھی اُس نے ''بینڈیج''
گردن میں ہاروں کے بدلے ''اسٹیتھو'' لٹکائی

کولڈ ڈرنکس میں اُس نے سب کو ''او آر ایس'' پلایا
ہر مہمان کو بوتل اُس نے طاقت کی لگوائی

باراتی لے جانے کو بھی ''ایمبولینسیں'' آئیں
''او پی ڈی'' میں اُس نے اپنی رسمِ عقد نبھائی

تصویروں کی جگہ پہ سب کے ایکسریز کروائے
اور مووی کی جگہ پہ سب کی ''الٹرا ساؤنڈ'' کرائی

لڑکی والوں کی خاطر بھی دیکھی بڑی انوکھی
چائے کے پیالوں میں وہ لے آئے لال دوائی

کچھ مہمانوں کو بیروں نے ''وٹامنز'' بھی بانٹے
کچھ بوڑھوں کو انہوں نے کی کشتوں کی سپلائی

دلہن کا ابا تحفے میں ''تھرمامیٹر'' لایا
دلہن کی اماں ''بی پی اپریٹس'' ہاتھ میں لائی

دلہن کو ''اسٹیچر'' پر وہ لے کر گھر کو لوٹا
ایسا منظر دیکھ کے میں بھاگا کہہ کر ''گڈ بائی''

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

موبائل فون مکینک کا ہیضہ

ہو گیا اِس پیٹ کا نیٹ ورک ڈھیلا ایک دن
بج اُٹھی مس کال پر مس کال میرے پیٹ میں

آؤٹ گوئنگ تھی فری اور ان کمنگ کوئی نہ تھی
تھا بڑا بیلنس کا مندا حال میرے پیٹ میں

لوڈ جتنا بھی کیا ان لوڈ ہو کر رہ گیا
سارا ایزی لوڈ تھا بے حال میرے پیٹ میں

رنگ ٹیونیں بج رہی تھیں پاپ میوزک کی طرح
تھے عجب انداز کے سُر تال میرے پیٹ میں

ڈاکٹر کی فیس سُن کر بیٹری لو ہو گئی
اب لگے گی چارجنگ پہ سال میرے پیٹ میں

تھے منٹ جتنے فری وہ بھی مرے پے ہو گئے
یوں کیا ہیضے نے استحصال میرے پیٹ میں

بچ گیا ڈیلیٹ ہونے سے دعاؤں کے سبب
ورنہ وقت چل گیا تھا چال میرے پیٹ میں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

خمسہ بر غزلِ مرزا غالبؔ

تمہارا ہاتھ جو مانگا تو ہاؤ ہُو کیا ہے
تمہارے والدِ ماجد کی یار خُو کیا ہے
کہا یہ سُن کے مرے دل میں آرزُو کیا ہے
مجھے بتا تری اوقات کیا ہے، تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

کبھی ہمیں بھی تو الفت کا درد سہنے دو
شرابِ عشق ہماری رگوں میں بہنے دو
ہزار بار کہا، دل کی بات کہنے دو
مگر ہمیشہ یہ کہتے ہو تم کہ رہنے دو
تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزُو کیا ہے

مرے رقیب نے جینا مرا کیا دوبھر
غلیل مار کے لت پت کیا ہے میرا سر
بچی ہے آنکھ، نشانہ لگا ذرا اوپر
کہا جو اُن سے تو کہنے لگے وہ اِٹھلا کر
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہُو کیا ہے

بنے تھے کل جو بہاری کباب کثرت سے
وہ کھالئے مرے سسرالیوں نے رغبت سے
میں تک رہا تھا بجھے کوئلوں کو حسرت سے
کہ میری سالی نے آ کر کہا شرارت سے
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجُو کیا ہے

ہمارے بس میں یہ کب تھا لکھا ہوا ٹالیں
چلی ہیں عشق میں ہم نے ہی بے تکی چالیں
اب ایک بھی نہیں، پہلے تھیں چار سسرالیں
ہیں سب محافلِ شعروسخن کی کچھ ”کالیں“
وگرنہ شہر میں شوکت کی آبرُو کیا ہے

شوکتؔ جمال

غالبؔ، برکھا رُت اور آم

احمد علی برقی اعظمی

مرزا غالبؔ ہے وہ نام
روحِ ادب ہے جس کا کلام

ہے موضوعِ سخن یہ شام
غالبؔ ، برکھا رُت اور آم

آم جو ہے غالبؔ کے لئے
بادۂ عشرت کا اِک جام

تھا یہ اُنھیں بیحد مرغوب
جو ہے قدرت کا انعام

ہند کی ہے یہ اِک سوغات
سارے جہاں میں ہے جس کا نام

سبھی پھلوں کا ہے سرتاج
کھاتے ہیں جس کو خاص و عام

آم کی عظمت سے انکار
اُن کی نظر میں ہے دشنام

اپنے سبھی ہم عصروں میں
سب سے اہم ہے اُن کا مقام

اُن کی طرز ہے وہ آغاز
جس کا نہیں کوئی انجام

آیئے مِل کر کھائیں آم
جس سے ملے اُن کو آرام

احمد علی برقی ہی نہیں
سب کے لئے ہے دعوتِ ''آم''

میٹرو بس

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ہاں شکنجے میں ذرا اب کس ہمیں
سانپ جمہوری ہے، آ جا ڈس ہمیں
کچھ نہیں ہے اس میں پیش و پس ہمیں
اِک کلو میٹر ہے، اِک سو دس ہمیں
اب چمن لگتا ہے خار و خس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

ہر طرف اُڑتا ہے اِک گرد و غبار
اب کہاں دیکھیں گے ساون کی بہار
گاڑیاں ہیں یوں قطار اندر قطار
جیسے پریاں دھوپ میں تڑپیں ہزار
کیوں نظر آتا نہیں بھرکس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

اُس طرف ہے گر مریضِ جاں بہ لب
ڈاکٹر کا دوسری جانب مطب
ڈرائیور کہتے ہیں کیسے جائیں اب
ہم کرایہ لیں گے دوگنا اس سبب
شہر کی سڑکیں لگیں سرکس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

ایک دولہا رو رہا تھا زار زار
سامنے اس کے تھی کاروں کی قطار
کھو گئے تھے راستے میں رشتہ دار
ہال میں دلہن تھی محوِ انتظار
کہتی تھی دے دے کوئی ڈھارس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

مرغ کا رستے میں قیمہ بن گیا
دال کا بالکل ہی دلیہ بن گیا
سرمئی جسموں کا سرمہ بن گیا
لوگ کہتے ہیں کہ ستا بن گیا
کیا بنا ڈالا ہے ”میٹرو بس“ ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

ٹھپ دکانیں ساری، کاروبار بند
پھرتے ہیں عاشق تو اُن کے یار بند
ایمبولینسوں میں ہیں سب بیمار بند
ٹیکسی، ویگن ، رکشہ، موٹر کار بند
کون کر سکتا ہے ٹس سے مس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

وقت کا ہرگز ہمارے ہو نہ LOSS
دیر سے آنے پہ ڈانٹے پھر نہ BOSS
گرد سے کم ہو نہ چہرے کا GLOSS
چوک سارے اُڑ کے ہم کرلیں CROSS
تو بنا دے بگلا یا سارس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

فیس بُک

میری خوش خیال حسین پری
مجھے فیس بُک پر یوں مل کبھی
مجھے فیملی میں تو ''ایڈ'' کر
مجھے فیوریٹ تو فرینڈ کر
کبھی یوں بھی آ مری وال پر
کبھی کر ''کومنٹ'' کبھی پیار سے
مری وال بھر دے بہار سے
کبھی ''لائیک'' کر مری ''پوسٹ'' بھی
کبھی چیٹ کر
(کبھی بات کر تو ''سکائپ'' پر)
کوئی ''لولی'' پک مجھے ''ٹیگ'' کر
کہ مہک اُٹھے مری وال بھی
مجھے ''پوک'' کر، مجھے جتنا چاہے تو تنگ کر

مری جانِ جاں پر مجھے کبھی نہ بلاک کر
میں کسی ''گروپ'' کی ''ایڈمن شپ'' جو دوں تجھے
مرے سب ''فرینڈز'' کے دل کو تو یونہی ''روسٹ'' کر
مرے نام سے کوئی پیاری پیاری سی ''پوسٹ'' کر
مری خوش خیال حسیں پری
مجھے فیس بُک پہ یوں مل کبھی!

زُبیر قیصر

ڈاکٹر احسن فاروقی

غالبؔ - حیوانِ ظریف

"حیوان ظریف" اردو تنقید نگاری کا سب سے اہم الہامی فقرہ ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ حالیؔ کی تنقیدی نظر ہمیں غالبؔ کی فطرت کے راز سے اس طرح آگاہ کرتی ہے جیسا کہ اردو کا کوئی تنقیدی فقرہ اب تک ہمیں کسی شاعر یا دیب کی فطرت سے آگاہ نہ کر سکا۔

ظریف اگر ادب میں کوئی اور ہوا تو وہ ولیم شیکسپیئر تھا۔ یہ دو ہی اور تیسرا شاید گوئٹے مکمل حیوان ظریف ہوئے۔ مکمل حیوان ظریف کیا ہوتا ہے۔؟ اس کا اندازہ لگانے کیلئے شیکسپیئر سے شروع کیجئے۔ شیکسپیئر کی سب سے عظیم تصنیف جو تمام یورپ کی بھی عظیم ترین تصنیف ہے وہ "کنگ لیئر" ہے۔ اس تصنیف میں المیہ نگاری اپنے کمال پر پہنچتی ہے، مگر لیئر کا المیہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ اگر اس میں سے اس کے فول کے مزاح کو نکال لیجئے۔

غالب کو نہ معلوم کیا کیا کہا گیا ہے مگر سب غلط، وہ حیوان ظریف کے سوا اور کچھ ہیں ہی نہیں۔ ان کو مفکر، المیہ نگار، غزل خواں، مدح سرا، تنقید نگار اور نہ معلوم کیا کچھ نہیں ثابت کیا گیا ہے۔ وہ یہ سب ہیں مگر یہ سب باتیں ان کی ظریف حیوانیت کا حصہ ہیں۔ وہ مکمل حیوانِ ظریف ہیں۔ جو اپنی ظرافت میں تمام کائنات کو ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے جذباتی تاثرات کو لے لیتے ہیں۔

کلاسیکی نقاد اٹھارویں صدی تک شیکسپیئر کو طربیہ نگار ہی مانتے رہے اور اس کی المیہ نگاری سے انکار ہی کرتے رہے۔ ظاہر ہے شیکسپیئر یونانی المیہ نگاروں کی سی فطرت ہرگز نہیں رکھتا تھا۔ مگر وہ یونانی طربیہ نگاروں کی طرح کا بھی

یوں تو دنیا میں لاکھوں قسم کے ظریف ہوئے مگر مکمل حیوانِ

ضرور ہوں گے۔ مگر اس کے بابت وہ کیا لکھتے ہیں۔ "وباتھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ۔ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد اور ایک چونسٹھ برس کی عورت۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی مرتا تو ہم جانتے کہ وباتھی۔ تف بریں وبا!"

امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کا انتقال ضرور المناک تھا۔ مگر غالب اس پر لکھتے ہیں۔ "امراؤ سنگھ کے حال پر اس واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ ہی پھندا ٹوٹتا ہے نہ دم نکلتا ہے۔"

غدر سے بڑا المیہ شاید ہی کوئی اور غالب کے سامنے گزرا ہو۔ اس کے درمیان غالب بھی لیئر کی طرح ہتھ پر پھٹے کپڑے شکستہ حال کھڑے ہیں اور آسمان سے تاریکی میں، بجلی تڑپ تڑپ کر پیڑوں کو جلا کر خاک کر رہی ہے مگر ان کی فطرت میں چھپا ہوا فول اپنی اڑانے سے نہیں چوکتا۔ غالب کے غدر کے زمانے والے مکاتیب کو "غدر کے واقعہ ہائلہ کی مرثیہ خوانی" کہا گیا ہے، مگر دیکھئے اس مرثیہ خوانی میں کتنی مزاح نگاری ہے۔ "میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

غالب ایک حد تک اس المیہ سے بچے ہوئے اس کا منظر ہی دیکھ رہے ہیں مگر اس کی زد میں بھی آجاتے ہیں اور سکے لکھنے کے الزام میں "پنشن بھی گیا اور ریست کا نام ونشان خلعت و دربار بھی مٹا۔" مگر اس عالم میں آکر ان کے خطوط میں مزاح کا رنگ اور بھی تیز ہو گیا۔ لکھتے ہیں۔ "میں نے سکہ نہیں کہا، اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اسے مٹا نہ سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بینک گھر اور میگزین لوٹنا

نہیں تھا۔ وہ نشاط الثانیہ کی روح تھا جو بنیادی طور ظریف تھی۔ مگر جس کی ظرافت کے دائرے میں ہر قسم کے تاثرات آجاتے تھے۔ لیئر کی تکالیف کے ساتھ آسمان وزمین متزلزل ہیں۔ مگر اس حد سے زیادہ تاریک عالم میں فول ہر جگہ اور ہر وقت اپنی مزاح کی پھلجڑیاں ہی چھوڑ رہا ہے۔ اس ڈرامے کا مصنف کیا ہے۔؟ حیوانِ ظریف، مکمل حیوانِ ظریف اور کچھ نہیں۔

غالب کی ہستی بھی یہی کچھ کرتی نظر آتی ہے۔ یورپ کے اور ہمارے ادب کے بنیادی فرق کا خیال رکھ کر دیکھئے۔ یورپ کا ادب زیادہ تر خارجی، ہمارا ادب زیادہ تر داخلی۔ شیکسپیئر بھی سامنے آئینہ رکھتا ہے، غالب خود اپنے سامنے آئینہ رکھتا ہے۔ غالب کی فطرت میں بھی لیئر اور اس کا فول ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اگر ایک کو الگ کر دیا جائے تو دوسرا بے معنی ہو جاتا ہے۔

غالب کی زندگی کنگ لیئر کا سا المیہ ہے، مگر المیہ کے ہر اہم جزو یا موقع پر حیوانِ ظریف کی فطرت بھی چمکتی نظر آتی ہے۔ وبا ضرور ایک المیہ ہے، اس کے المناک مناظر غالب کے سامنے

معاف ہو جائے گا اور شاعر کے دو مصرے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانبدار نہیں۔"

دلی کے مکانوں کو ڈھایا جانا وہ دردناک طریقہ پر بیان کرتے ہیں۔ مگر میر مہدی کی آنکھیں دکھنے آگئی ہیں تو مزاح کا رنگ یوں پھوٹ نکلتا ہے۔ "تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اڑی، اس کو آپ نے از راہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔"

دلی کے لوگوں کی تباہی اور بربادی کے نقوش ان کےخطوط میں بڑی گہری المناکی سے ابھرتے ہیں مگر ان ہی میں حافظ محمد بخش کا لطیفہ بھی آ ہی جاتا ہے۔" حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں، پھر پوچھا کہ حافظ مموں کون؟ عرض کیا کہ میرا جو دنیا میں ہے وہ بھی تم، ہم مکان کس کو دیں، مسل داخل دفتر ہوئی، میاں مموں اپنے گھر چلے آئے۔"

غالب کا ادراک بھی آفاقی ہے، جس میں دردناک سے دردناک بات کے پس منظر میں بھی ایک شگفتگی ہے، جو درد کے پیچھے ایک عجیب دائمی مسکراہٹ کو چھپا ہوا دکھاتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک آفاقی مسکراہٹ کے پردے سے ہیبت، پریشانی، دردو غم، حس، عظمت، گناہ، نیکی کے نقوش ابھرتے ہیں اور تمام تکلیف دہ صورتوں کو بھی ایک آفاقی ہمدردی کی سطح پر نقش و نگار کی طرح دکھاتے ہیں۔ ناامیدی کا اس سے بہتر اظہار اور کیا ہو سکتا ہے:

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

مگر اس شعر کو جتنا پڑھتے جایئے، اتنی ہی ناامیدی دور ہوتی

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت، کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

مگر اس شعر کو جتنا پڑھتے جایئے، اتنی ہی ناامیدی دور ہوتی جاتی ہے۔ ایک عجیب تسکین کا عالم طاری ہو جاتا ہے، امید اور ناامیدی آرزو سے وابستہ ہیں مگر یہ شعر ہمیں وہاں لے جاتا ہے، جہاں آرزو ہی آفاق کے دائمی رنگ میں غائب ہوگئی، جہاں کائنات کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ دائمی شگفتگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اپنے ایک شعر میں غالب نے کہا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میں نے اپنے مضمون "مزاح اور مزاح نگاری" میں اعلیٰ ترین درجہ مزاح کی وضاحت کرتے ہوئے مضمون کو اس شعر پر ختم کیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ غالب کا ہر شعر اس عالم سے نکل کر آتا دکھائی دیتا ہے۔ اعلیٰ ترین مزاح ایک عجیب قسم کی ہمدردی کا نام ہے، جو مزاحیہ تخلیق کو یا مزاح نگار کو ہمارا قریب ترین دوست بنا دیتی ہے۔ شیکسپئر کی طرح غالب بھی ہمارے قریب ترین مخلص دوست ہو جاتے ہیں۔ ہماری زندگی کے ہر قدم پر اور ہر موقع پر ان کے شعر ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمای وقتی الجھنوں کو، دل دوز تکالیف کو ایک نئی تشکیل دے کر اس آفاقی مزاج سے ہم آہنگ کرتے ہیں جو ہمارے لیے تسکین کی آخری پشت پناہ ہے۔ غالب کے کثرت سے شعر ایسے ہیں، جو صاف طور پر مزاحیہ ہیں اور ہر ہر قسم کے مزاح کی مثال ان کے اشعار سے دی جا سکتی ہے۔ پھکڑ لیجیے:۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

مزاحیہ حالت کے نقشے لیجیے:۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ قدم میں نے پاسباں کے لیے

میں نے کہا "بزم ناز چاہیے غیر سے تہی"
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

نفسیات پر مزاح لیجیے:۔

ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے!

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

ذکاوت، لطیف طنز، چوٹ، ہر چیز کی کثرت سے مثالیں ملتی چلی جائیں گی، مگر میں اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اور جس کی اب تک وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ وہ غالبؔ کی فطرتِ ظریف ہے جو ان کے ہر شعر کو ہمارے سامنے ہر مشکل وقت پر لا کر ہماری ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے اور ہمارے اندر وہ لا پروائی پیدا کر دیتی ہے جو مزاح کی روح ہے۔ غالبؔ کے وہ اشعار بھی جو زندگی کی تلخیوں کے تکلیف دہ مناظر پیش کرتے ہیں، اپنے اندر ایک لطیف مزاح مضمر رکھتے ہیں۔ جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان کو پڑھ کر دائمی مسکراہٹ کے کیف میں پہنچ جاتے ہیں۔

غالب کا پورا دیوان اس متحد اور مکمل ادراک کی مثال ہے جس کی بنیادی سطح مزاح ہے۔ حالؔی اس کی تنقیدی تحلیل نہ کر سکے۔ مگر غالبؔ کو حیوانِ ظریف کہنے سے ان کا مطلب یہی تھا۔ آسی صاحب نے شرح دیوانِ غالب کے دیباچہ میں کثرت سے شعر غالبؔ کی پوشیدہ ظرافت کی مثال میں پیش کیے ہیں۔ غالب مفکر ہیں اور فکر کی گہرائیوں میں جہاں وہ پہنچے ہیں وہاں اقبال کے سوا کوئی اردو شاعر نہیں پہنچا۔ مگر ان کی بڑی سے بڑی فکر میں بھی ایک پرت ظرافت کی ضرور چڑھی نظر آتی ہے۔ ان کے فارسی اشعار میں بیشتر فکر میں ظرافت شامل نہیں نظر آتی۔ مگر اسی فکری نکتہ کو جب وہ اردو میں ادا کرتے ہیں تو ظرافت شامل ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ مثلاً فارسی کا شعر ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
می تو آں یافت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

یہی بات اردو میں آتی ہے تو یہ صورت اختیار کرتی ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہاں دوسرے مصرع میں مزاح صاف ہے۔ جنت کے اہم مسئلہ کو وہ مزاح سے حل کرتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

قیامت کے سلسلے میں مزاح کچھ پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ مگر وجود اس کا شعر کی جان نظر آتا ہے:

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

ان کے سنجیدہ سے سنجیدہ اشعار اور غزلیں المیہ کے ساتھ طربیہ کا ویسا ہی امتزاج پیش کرتے ہیں جیسے کہ "کنگ لیئر" میں لیئر پیش کرتا ہے۔

شرارتی لکیریں
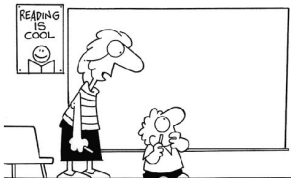
یہ بلیک بورڈ ہے ڈیئر۔۔۔ یہاں کلک کرنے کے لئے کوئی آئی کون نہیں!!

کیا یہ گھڑی رُکی ہوئی ہے ؟؟؟؟؟

کیا یہ گھڑی رُکی ہوئی ہے ؟؟؟؟؟

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اچھا تو مشاعرے میں دیر ہو گئی.... کس غزل کے گھر سے آ رہے ہو؟

سرمایہ دارانہ نظام

ٹیلی وژن دیکھنے کا صحیح طریقہ

اُف یہ گرمی

پسینے کے زمانے آ گئے ہیں
ہوا محسوس، تھانے آ گئے ہیں
جہاں کندہ کیا تھا نام تیرا
وہاں اب گرمی دانے آ گئے ہیں
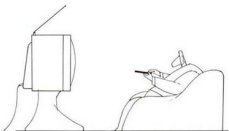
ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

بزمِ نسواں

شیو تازہ کیے، کپڑے بھی نئے پہنے ہوئے
صورتیں سب نے چمکدار نکالی ہوئی ہیں
بزم نسواں میں خواتین کہاں پر بیٹھیں
سب کی سب کرسیاں مردوں نے سنبھالی ہوئی ہیں

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

ہائے عمران کی شادی

ہر میچ اس کے واسطے میں دیکھتی رہی
چاندی کے تار سر پہ پریشاں کیے ہوئے
اک بدچلن نے چانس ہی نِل کر دیا مرا
بیٹھی تھی میں تہیۂ عمراں کیے ہوئے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

ردِعمل

اتنا اس کا عمل غلط نہیں تھا
جتنا رد عمل دکھا آیا
ناروا دیکھ کر سلوک اس کا
لڑ کے میں ناروے چلا آیا

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

سید۔شیخ

شکریہ ! زیرِ نظر ہے ''ارمغانِ ابتسام''
نام کیا میرا لکھا ، مجھ کو ہنسایا آپ نے
پھولؔ کے لب پر تبسم ہے مدیرِ ''ابتسام''!
''شیخ صدیقی'' کو ہے ''سید'' بنایا آپ نے

تنویرالدین احمد پھولؔ

کتابت۔کمپوزنگ

پھولؔ! آیا ہے نظر یاں بھی کتابت کا کمال
حضرتِ اکبر الہ آبادی یہ فرما گئے
کونسلوں کو گھونسلوں اور سیٹ کو لکھتے ہیں بیٹ
گھونسلوں میں بیٹ کر دی اور انڈے کھا گئے

تنویرالدین احمد پھولؔ

لائسنس۔نکاح نامہ

جوان اِک انسپکٹر ہیں، ملازم ہیں جوٹی وی کے
محلے والوں سے کرتے طلب لائسنس ٹی وی کا
گئے ساحل پہ اِک دن لے کے بیگم خوبرو اپنی
پولیس والا یہ بولا، ہے کدھر لائسنس بیوی کا؟

تنویرالدین احمد پھولؔ

خاتون کا بھید

دیکھ کر بیٹے کی پاکٹ میں حسیں تصویر کو
اُس سے پوچھا باپ نے یہ کون سی خاتون ہے
بیٹا بولا سہم کر مجھ کو نہیں معلوم کچھ
آج جو پہنی ہے میں نے آپ کی پتلون ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

ماس زیرو (ZeroMass)

کل کسی کالج میں طبیعات کے اُستاد نے
پوچھا اک شاگرد سے ''بھئی! ماس زیرو ہے کہاں؟''
سوچ کر شاگرد نے اُستاد سے اتنا کہا
گھونسلے میں چیل کے اِس کا نہیں نام ونشاں

محمد عاطفؔ مرزا

امتحانِ عشق

امتحانِ عشق میں بوٹی لگانی چاہئے
شامل پیپر ہے کیا کچھ گیس بتاؤ دوستو !
چھولے دیکر پاس ہونے کی روایت خوب ہے
ممتحن کو خوب تم چھولے کھلاؤ دوستو !

محمد عاطفؔ مرزا

کوچا

مرچ کا کوچا پڑوسن نے ہمیں بھیجا تھا کل
خوش نہ تھیں بیگم مگر اِس جذبۂ ایثار سے
جل کے بولیں اب اسے کھانا نہ بیتابی سے تم
جیسے آیا ہو یہ کوچا کوچۂ دلدار سے

شوکت جمال

روٹی کپڑا اور مکان

جج سے ہے گزارش کہ مری قید بڑھا دے
مل جاتا ہے جو جیل میں ''بے دام'' بہت ہے
روٹی بھی ہے کپڑا بھی ہے رہنے کو مکاں بھی
''گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے''

شوکت جمال

نقاب پوش

میں کس کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کروں
''مریضِ سرجری'' یکدم لگا تھا چلانے
یہ ڈاکٹر ہیں کہ ڈاکو، تمیز مشکل ہے
نقاب پوش پھریں ہیں پہن کے دستانے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لوڈشیڈنگ

کر رہے ہیں یہ وزیرِ پانی و بجلی اپیل
چاہیے معبود کو بھی کچھ سفارش کے لئے
ہم سے مت کہنا بڑھے گر لوڈشیڈنگ ملک میں
کیوں دعا کرتی نہیں ہے قوم بارش کے لئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پنکھے کی فضیلت

آؤ تم لوگ بھی اس پنکھے کے نیچے بیٹھو
میرے اس پنکھے نے ٹھنڈک کو ابھارا ہوا ہے
اس کے ہر جھونکے سے جنت کی ہوا آتی ہے
میں نے اس پنکھے کو مسجد سے اُتارا ہوا ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

اک ستم اور۔۔۔

سیلری ہے ہماری زیادہ ابھی
جسٹیفائی کریں ریٹ ہائی کریں
نوکری کر رہے ہیں اسی واسطے
تاکہ بجلی کے بل کی ادائی کریں

نوید ظفر کیانی

لکھنے والے